UNIVERSAL LIBRARY

OU_222165

UNIVERSAL LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. Accession No.

Author

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

ہنس سیریز ——— اُردو

۸۹

جلن

جمنا داس اختر

پبلشرز انارکلی مکتبہ رنگین ۱۰۹۷ گنج میر خان دھلی

کتاب خانہ عابد روڈ حیدرآباد دکن

جملہ حقوق بحق پبلشر محفوظ ہیں

۱۶۲۵۹

پہلی بار..... ایک ہزار

قیمت دو روپے

نعمانی پریس ترکمان گیٹ دہلی میں چھپا ——— پبلشر ہنس راج رنگین

موہن کے آنسوؤں کے نام

موہن میرا بیٹا ہے۔
برسوں گزرے اپنے مکان کے باغیچے میں چہچہاتی ہوئی مینا سے اُسے اُنس ہوگیا تھا وہ سیٹی بجاتا اور مینا بے خوفی سے اُس کے قریب آجاتی۔
ایک دن موہن نے اُسے پکڑ کر پنجرے میں بند کر دیا۔ وہ خوش تھا۔
مینا اُداس ہوگئی۔ اُس نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔
موہن نے اُسے پنجرے سے باہر نکال کر منانے کی کوشش کی اور ــــــ
مینا اُڑ گئی ــــــ
اُس نے کہا ــــــ اب میں کبھی نہیں آؤں گی۔
موہن دیوانہ سا ہوگیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہنے لگیں۔
وہ اکثر خواب میں بڑبڑانے لگتا۔
وہ پاگل ہے۔
مجھے ہنسی آگئی۔ میری بیوی بھی ہنس پڑی۔
مگر اُس کے آنسو نہیں رُکے۔
میں نے دیکھا ــــــ صبح سویرے میں نے اُسی باغیچے سے جو خوشنما پھول توڑ کر اپنے کوٹ پر لگا لیا تھا وہ مُرجھا گیا تھا۔

میری آنکھوں سے بھی آنسو نکل آئے۔
میں نے محسوس کیا ——— موہن کے آنسو کتنے قیمتی ہیں۔
یہ آنسو خشک ہو چکے ہیں، مگر ان کی جلن ابھی تک باقی ہے۔
میں اپنا تازہ ترین ناول "جلن" انہی آنسوؤں سے معنون کرتا ہوں۔

[illegible] جمنا داس اختر

پیش لفظ

مجھے جمنا داس اختر کو آپ سے متعارف کرانے کے لئے کہا گیا ہے، لیکن جو لوگ انہیں شمالی ہند کے چوٹی کے روزنامہ "تیج" کے مدیر اعلیٰ۔ ایک مجلسی کارکن اور "آنسو" "آگ"۔ "پردہ فروش"۔ "چند رکلا"۔ "پائل"، "پھانسی کی کوٹھری" اور "کانٹے" کے مصنف کی حیثیت سے جانتے ہیں وہ جمنا داس اختر کو اس قدر قریب سے دیکھتے آئے ہیں کہ مجھے جمنا داس کے متعلق کچھ اور لکھتے ہوئے جھجک سی محسوس ہوتی ہے۔

جمنا داس اختر ان مصنفوں میں سے ہیں جو نچلے (درمیانے) طبقے سے آئے ہیں اور جو زندگی کی کشمکش میں ہمیشہ گرفتار رہے ہیں۔ اس لئے اس کشمکش میں مجلسی ناانصافیوں انسانی جذبات کی پامالی۔ گرم گرم آنسوؤں اور سسکیوں کے دور سے نہ صرف دوسروں کو گزرتے ہوئے دیکھتے ہیں بلکہ خود بھی انہی مصائب سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ اسلئے جب وہ لکھنے لگتے ہیں تو عام ادیبوں اور ناول نویسوں کی طرح عبارت آرائی کرنے کی بجائے زندگی کے تلخ حقائق کو سیدھے سادے طرز پر قلمبند کرتے ہیں۔ جمنا داس اختر میں سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ اس طرز سے لکھتے ہیں کہ ان کی تحریر کا ایک ایک لفظ پڑھنے والے کے دل میں کھب جاتا ہے اور وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ کوئی ناول نہیں پڑھ رہا بلکہ خود بھی زندگی کی اسی کڑی کشمکش سے گزر رہا ہے۔

"آنسو"، "آگ" اور "پردہ فروش" جمنا داس اختر کے ذاتی مشاہدوں کا نتیجہ تھے جمنا داس

اختر نے درجنوں معصوم لڑکیوں کو جلسی ڈاکوؤں کے چنگل سے چھڑایا اور یہی لڑکیاں جنہیں انہوں نے ایک شفیق باپ کی طرح پناہ دی، اُن کے ناولوں کی کردار ہیں۔

"پھانسی کی کوٹھڑی" کا مصنف نہ ہونے کا وہ لاکھ دعوے کریں لیکن اُس کا طرزِ تحریر صاف ظاہر کرتا ہے کہ وہ خود ہی اُس تمام ڈرامے کے مشاہد ہیں۔ "پائل" میں انہوں نے ایک واقعہ کو ناول کا رنگ دیا اور اُس میں کامیاب رہے۔

"جلن" میں انہوں نے جن واقعات کو ناول کی شکل دی ہے وہ کس کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، یہ جاننے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اُن کا طرزِ تحریر دیکھ کر تو ایک انسان اچانک چونک پڑتا ہے اور اُسے یوں محسوس ہوتا ہے گویا اِس ناول کا مصنف بنگال کا مشہور ناول نویس سرت چندر چیٹرجی ہے۔ درحقیقت جمنا داس اختر کا طرزِ تحریر بہت حد تک سرت چندر سے ملتا جلتا ہے اور یہ بات یقیناً اُس کے کریڈٹ کو جاتی ہے۔

"جلن" میری رائے میں ایک کامیاب ناول ہے۔ کیونکہ اِس میں نہ صرف ہمارے سماج کے متعلق اہم مسائل کو پیش کیا گیا ہے بلکہ اِس میں ہمارے لئے ایک سبق بھی موجود ہے۔ اِس ناول کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اِس کی تحریر پاکیزہ ہے۔ اِس کے لئے میں جمنا داس اختر کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

برش بھان
سابق ڈپٹی چیف منسٹر
پٹیالہ یونین!

پہلا باب

وہ بچّہ بدقسمت ہوتا ہے جس کی ماں اُسے کمسنی میں ہی چھوڑ کر چل بسے۔ اگر وہ چلبلا ہے تو بُری سوسائٹی میں پھنس کر آوارہ اور بدچلن ہو جاتا ہے اور اُس کی جلن اور غصّہ اپنے لئے خود نئی راہیں ڈھونڈ لیتا ہے۔ لیکن اگر وہ سنجیدہ ہے اور فطرتاً شریف ہے تو اُس کے جذبات اُسے اندر ہی اندر جلاتے رہتے ہیں۔ ایسے بچّے زبان سے بے شک کچھ نہ کہیں، لیکن وہ دوسروں سے زیادہ محسوس کرتے ہیں اور جب اُن کا پیمانۂ صبر لبریز ہو جائے تو چُپکے سے کنارہ کشی کر لیتے ہیں۔

گھنشیام کی حالت آخرالذکر کی سی تھی۔ اُس کے پتا کاشی ناتھ لکھنؤ کے بیرسٹر تھے اچھی خاصی آمدنی تھی۔ گھر کا بنگلہ اور گھر کی موٹر تھی، لیکن گھنشیام ابھی میٹرک ہی میں پڑھ رہا تھا کہ کاشی ناتھ جی نے اپنی پہلی دھرم پتنی کے مرنے پر دوسری شادی کر لی۔ نئی ماں آنے کی خبر پر گھنشیام کو خوشی ہوئی یا رنج یہ تو کوئی کہہ نہیں سکتا۔ شاید وہ خود بھی کچھ نہیں جانتا تھا لیکن یہ بھاگیہ واس شریمتی نرملا دیوی نے جب شوہر کے گھر میں قدم رکھا تو اُسے نہ جانے کیوں محسوس ہونے لگا کہ اُس گھر پر اُس کے سوا کسی کا حق ہی نہیں اور جب یہ محسوس کر کے اُس نے کاشی ناتھ جی پر حکومت کا سا رعب ڈالنا شروع کیا تو گھنشیام نے محسوس کیا کہ جس گھر میں وہ برسوں لاڈ پیار سے رہتا آیا ہے اب اُس گھر میں اُس کی حیثیت ایک اجنبی کے سوا اور کچھ نہیں۔

گھنیشام کو سکول پہنچانے اور واپس لانے کے لئے موٹر کا سلسلہ بند ہو گیا۔ کیونکہ بیرسٹر کاشی ناتھ کی نئی نویلی دُلہن کو سیر کرنے اور سہیلیوں سے ملنے کے لئے موٹر کی ضرورت گھنیشام سے زیادہ تھی۔ کاشی ناتھ جیسا شے نے محسوس نہیں کیا یہ بات نہیں تھی، لیکن پہلے پہل وہ یہی سمجھتے رہے کہ نئی نویلی دُلہن ہے اس لئے یہ برداشت ہی کرنا چاہیئے، لیکن ایک دن کڑکتی دھوپ میں پیدل آتے ہوئے بچّے کے چہرے کو بجھا ہوا دیکھا تو نرملا کو ٹوک ہی دیا۔

نرملا ڈرائیور کے ساتھ اکیلی ہی آئی تھی۔ اُس نے پتی دیو کے چہرے کو جبر پر اُمتر سے کی رگڑ کے باوجود سفید سفید تنکے سے بال نظر آتے تھے، دیکھا اور بھڑک کر کہنے لگی۔ تمہارا لاڈلا موٹر کے بغیر سکول نہیں جا سکتا تو اُس کے لئے ٹیکسی کا انتظام کر دیا نئی موٹر خرید لو۔ ہمیں تو پیدل جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔

یہ کہہ کر نتھنے پھلاتی، ساڑھی کے پلّو کو لہراتی اور زُلفوں کو سنوارتی ہوئی نرملا جس تیزی کے انداز سے اپنے کمرے میں داخل ہو گئی اُس سے بیرسٹر صاحب نے محسوس کر لیا کہ اِن تلوں میں تیل نہیں۔

گھنیشام کو ایسے لگا گویا اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنا چاہتے ہیں۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں داخل ہو گیا اور بیرسٹر صاحب سوچتے رہ گئے کہ اب اِس گھر میں کبھی سکون آ بھی سکے گا یا نہیں۔

نرملا صرف اسی بات سے جل بھُن گئی تھی۔ شاید وہ سوچتی تھی کہ بیرسٹر صاحب کو گھنیشام کا اتنا ہی خیال تھا تو اُنہوں نے اِس عمر میں اُس سے شادی ہی کیوں کی تھی۔ وہ بیرسٹر ہیں، اچھی خاصی آمدنی ہے، نوکر چاکر ہیں، اولاد بھی ہے۔ پھر اُنہیں نئی دُلہن لانے کا چاؤ تو محض اِس لئے کہ اُن کی آرزو ہیں اِس بڑھاپے میں بھی اُنہیں جوان بنانا چاہتی ہیں اور جب اپنی زندگی کو مسرّت انگیز بنانے کے لئے اُنہوں نے اُسے حاصل کیا تو اُسے بھی تو حق ہے کہ وہ اُن پر حکومت کرے اور اس کی مسرّتوں میں کسی کا دخل نہ ہو۔ گھنیشام کوئی بھی ہو اُس کے پیٹ سے پیدا نہیں ہوا۔ وہ اُس کے لئے اپنی مسرّتیں قربان

نہیں کر سکتی۔

جوں توں کر کے گھنیشام نے میٹرک پاس کر ہی لیا۔ وہ لائق تھا اور شریف بھی مگر نرملا کو گھنیشام کی یہ دونوں خوبیاں ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ وہ چاہتی تھی کہ گھنیشام نالائق ہو، بدمعاش ہو، آوارہ ہو تاکہ وہ اُسے خوب بدنام کر سکے۔ خوب جلی کٹی سنا سکے اور اگر موقع ملے تو اُسے گھر سے بے دخل بھی کر دے تاکہ نہ بانس رہے اور نہ بانسری بجے۔

گھنیشام روز روز کے جھگڑوں سے پریشان ہو رہا تھا۔ شروع شروع میں اُس نے پتا جی سے شکائتیں کیں لیکن جب پتا جی کچھ نہ کر سکے تو وہ خاموش ہو گیا۔ اُس کے بعد اگر اُسے وقت پر کھانا نہ ملتا یا سوتیلی ماں ڈانٹ ڈپٹ بتاتی تو وہ خاموش ہو جاتا۔ اُس نے باپ سے شکایت کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ دل ہی دل میں جلتا اور اکثر سوچتا کہ اگر اُسے موقع ملے اور کوئی دوسری نظر آئے تو وہ اِس گھر کو خاموشی سے ہی تلانجلی دے دے۔

ایک دوست کے ذریعے اُسے لکھنؤ میں ہی ایک ٹیوشن مل گئی تھی۔ سکول میں پڑھائی کرنے کے بعد وہ وہیں چلا جاتا اور سریش بابو کی لڑکی کو پڑھاتا تھا ـــ لیکن اِدھر اُس نے میٹرک پاس کیا اُدھر سریش بابو نینی تال چلے گئے۔ نینی تال میں اُن کی اپنی زمینداری تھی۔ وہ وہیں رہنا چاہتے تھے۔ اِس لئے اُن کے جاتے ہی گھنیشام کی ٹیوشن بھی ختم ہو گئی۔

نرملا نے سوتیلے بیٹے کو سناتے ہوئے کہا۔ ختم ہو گئی تمہاری ماسٹری؟ اب ہمارے ٹکڑوں پر پلنا چاہتے ہو گے نا! ہاتھ دھو رکھو ـــ بڑے ہو گئے ہو کماؤ اور کھاؤ ـــ ہم سے تو تمہارے کالج کا خرچ برداشت نہیں ہو سکتا!

گھنیشام منہ لٹکا کر کھڑا رہا۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

نرملا اور بھی بھڑک اُٹھی ـــ اُلّو ہے اُلّو ـــ اتنا نالائق لڑکا تو کبھی دیکھا ہی نہیں۔ میٹرک پاس کرا دیا۔ اب جوان ہو کر اپنا انتظام بھی نہیں کر سکتے تو ہمیں کہاں

سے کھلاؤ گے۔

گھنشیام کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

اس رات نرملا نے پتی دیو کے آتے ہی گھنشیام کی بدزبانی کی ایک لمبی چوڑی شکایت پیش کر دی۔ وہ کہہ رہی تھی —— آخر گھنشیام اس کے پیٹ سے تھوڑا ہی پیدا ہوا ہے اس لئے وہ اس کی عزت کیوں کرے —— آج اس نے اتنی بے عزتی کی کہ وہ کانپ اٹھی میٹرک کیا پاس کر لی خدا ہو گیا۔ گالیاں دینے پر اتر آیا ہے۔ کہتا تھا جب سے وہ چڑیل کی طرح اس گھر میں گھس آئی ہے گھر اجاڑ ہوتا جا رہا ہے —— گویا میں چڑیل ہوں چڑیل ——

کاشی ناتھ نے کوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکاتے ہوئے کہا —— اس بدمعاش کی اتنی جرأت کہ اپنی ماں کو گالیاں دینے لگا ہے۔ کئی دن سے اسے کچھ کہا نہیں شاید اسی لئے اس کا مزاج بگڑ رہا ہے۔

گھنشیام بے گناہ ہونے کے باوجود پٹ گیا۔ کاشی ناتھ نے ہنٹروں سے اس کی پیٹھ لال کر دی۔ وہ بہت رویا بہت چلّایا۔ نرملا دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی مگر چالاک عورت کی طرح دکھاوے کے لئے کاشی ناتھ کو روک رہی تھی۔

کاشی ناتھ بیٹے کو اس کی بے گناہی کی سزا دے کر فاتحانہ انداز سے کمرے سے باہر نکلے تو الٹی میٹم دیتے گئے کہ اگر وہ اپنی ماں کے اشارے پر نہیں چلے گا تو اس کے لئے اس گھر میں کوئی جگہ نہیں ہوگی۔

اور گھنشیام سوچنے لگا —— ماں کا اشارہ کیا ہے جس پر اس نے چلنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے کبھی ماں کی شان میں گستاخی نہیں کی۔ پھر بھی وہ اس کے خلاف جھوٹی شکایتیں کر کے اس کے باپ کو اس کے خلاف بھڑکاتی ہے اور وہ بلا سوچے سمجھے اسے پیٹنے لگ جاتے ہیں۔ آخر اس نے دوش ہی کیا کیا ہے —— شاید اس کا دوش یہ ہے کہ اس کی اپنی ماں مر چکی ہے تو وہ کیا کرے۔ وہ بھی مر جائے۔ اسی جگہ چلا جائے جہاں اس کی ماں جا چکی ہے

گھنیشام کے جسم پر ہنٹر کی ضربوں سے نیلے نیلے نشان پڑ چکے تھے۔ اُس نے بجلی کی روشنی میں دیکھا تو کانپ اُٹھا اور کھلی کھڑکی سے آتے ہوئے ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں اُس نے محسوس کیا کہ اُس کے درد کی شدّت بڑھتی جا رہی ہے۔ اُس نے سوچا اُس کے دُکھوں کا انت کب ہوگا۔ کیا اُسے آتم ہتیا کر لینی چاہیے یا گھر سے بھاگ جانا چاہیے۔ آتم ہتیا کے خیال سے وہ کانپ اُٹھا۔ بچہ ہی تو تھا بلک بلک کر رونے لگ گیا۔

صبح وہ جان بوجھ کر دیر سے اُٹھا۔ کوئی اُسے جگانے یا بُلانے نہیں آیا تھا اور جب کمرے سے باہر نکل کر اُس نے ماں باپ دونوں کو غائب دیکھا اور نوکر سے پوچھا تو اُسے جواب ملا ـــــ "بابو جی اور بی بی جی سیر کرنے گئے ہیں۔ کہہ گئے ہیں کہ آج کھانا پکانے کی ضرورت نہیں۔ شام کو آئیں گے تو کھائیں گے۔"

گھنیشام کا دل رو اُٹھا ـــــ نوکر کے جواب کا مطلب یہ تھا کہ آج گھنیشام کو بھوکا رہنا پڑے گا۔ شاید اُس کی بے گناہی کے باوجود اُسے رات کو جو مزا ملی تھی اُسے سوتیلی ماں نے ناکافی سمجھا تھا۔ اسی لئے وہ اُسے بھوکا رہنے کے لئے چھوڑ کر خود سیر کرنے کے لئے کھسک گئے تھے۔

نوکر کو رسا جواب دینے کے بعد باہر نکل گیا تھا۔ شاید سوتیلی ماں نے اُسے یہی کرنے کا اشارہ کیا ہو۔

تو میرے لئے اِس گھر میں کوئی جگہ نہیں ـــــ اُس نے دِل ہی دِل میں سوچا۔ اور پھر ـــــ اُس کے دماغ میں کئی بھیانک منظر ایک ساتھ ناچ اُٹھے۔ اُس نے کئی بچّوں کی کہانیاں پڑھی تھیں جن کے ماں باپ بچپن میں مر گئے تھے اور اُنہیں گداگری کرنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ اُسے خیال آیا ـــــ ایک مرتبہ اُس نے کچھ یتیم بچّوں کو ایک شخص کے ساتھ قطار باندھے کھڑے دیکھا تھا۔ وہ ہارمونیم بجاتا تھا اور وہ گا کر پیسے مانگتے تھے ـــــ کیا اُسے بھی یہی راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ کیا وہ بھی گلی کی نکڑ پر کھڑا ہو کر گداگری کے لئے مجبور ہوگا۔

اُس کے جسم میں کپکپی سی پیدا ہوئی۔ وہ سہم گیا اِس خوفناک تصوّر سے ـــــ

کئی دن بعد جب سریش بابو اُسے اچانک بازار میں مل گئے اور وہ اُن کے ساتھ اُس ہوٹل میں چلا گیا جہاں وہ لکھنؤ میں کسی کام کے لئے آکر ٹھہرے تھے تو اگرچہ گھنشیام نے اُنہیں کوئی بات بتانے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن سریش بابو نے باتوں ہی باتوں میں معلوم کر لیا کہ گھنشیام پر کیا بیت رہی ہے۔ اُنہوں نے کہا۔ سکول میں ملازمت کر دے گیا؟ پچاس ساٹھ مل جائیں گے اور ساوتری کی ٹیوشن کر لینا۔ رہنے اور کھانے پینے کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔

گھنشیام خوش ہوا اور اُداس بھی۔ خوشی اِس لئے کہ اُسے نجات کی راہ نظر آگئی اور اُداسی اِس لئے کہ کچھ بھی ہو آخر اُسے گھر سے نکلنا ہی پڑے گا۔ اِتنے بڑے گھر میں اُس کے لئے واقعی کوئی جگہ نہیں رہے گی۔

نرملا کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اُس نے دکھاوے کے لئے اُس روز پہلی مرتبہ اُس سے مسکرا کر بات چیت کی۔ اپنے دشمن کو دُور ہوتے دیکھ کر اُسے جو اطمینان ہوا اُسے پوشیدہ رکھتے ہوئے اُس نے کہا۔ "دیکھنا وہاں کوئی گستاخی نہ کر بیٹھنا ورنہ سریش بابو نے جواب دے دیا تو تمہارے لئے سنسار میں کوئی ٹھکانہ نہیں رہے گا"

گھنشیام نینی تال پہنچا۔ سریش بابو کی اچھی خاصی زمینداری تھی ـــــ سکول تھا ایک چھوٹا سا جس میں گاؤں کے بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھایا جاتا تھا۔ رہنے کے لئے اُسے سریش بابو کے گھر میں ہی جگہ مل گئی۔

وہیں اُسے سریش بابو کی کمسن لڑکی سنتوش اور اُس کی بڑی بہن ساوتری کو پڑھانے کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ سنتوش چلبلی اور شرارتی لڑکی تھی۔ گھنشیام اُسے لکھنؤ میں بھی پڑھا چکا تھا۔ اِس لئے اُسے دیکھتے ہی وہ "ماسٹر جی! آپ آگئے" کہتی ہوئی اُن سے چمٹ گئی۔ گھنشیام نے پیار سے اُسے اٹھا لیا۔

ساوتری خاموش کھڑی رہی۔ ایک اجنبی کو سامنے کھڑا دیکھ کر اُس کے چہرے پر حیا کی سُرخی پھیل گئی۔

پہلے روز پڑھائی کے وقت بھی گھنشیام نے دیکھا کہ ساوتری اور سنتوش میں زمین

آسمان کا فرق ہے۔

پڑھائی کے کمرے میں سب سے پہلے سنتوش نوکر کو لئے ہوئے آئی۔ نوکر کے ہاتھ میں گلاس تھا۔ سنتوش نے کہا۔ ساوتری بہن نے بھیجا ہے کہتی تھیں کہ کام شروع کرنے سے پہلے دودھ پی لو۔

گھنشیام ایک لمحہ خاموش رہا۔ نوکر کے چلے جانے کے بعد اُس نے پوچھا۔ تمہاری بہن تمہیں بھی دودھ دیا کرتی ہے کہ نہیں؟

سنتوش نے اچھل کر کہا ــــ ہر روز۔ اُسے مجھ سے بہت محبت ہے۔

ساوتری کو مڈل کے لئے تیار کرنا تھا۔ جب وہ کمرے میں آئی تو خاموشی سے بیٹھ گئی۔

گھنشیام کو یہ معلوم کرنے میں کچھ دیر نہ لگی کہ ساوتری بہت ذہین لڑکی ہے اور وہ بڑی ہو کر ڈاکٹر بننا چاہتی ہے۔

پڑھائی شروع ہو گئی اور دن گزرنے لگے۔ گھنشیام گھر سے عملی طور پر الگ ہو چکا تھا یا دوسرے لفظوں میں گھر میں اُس کے لئے کوئی جگہ نہیں رہی تھی۔ اُس نے باپ کو کئی خط لکھے تھے لیکن انہوں نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ وہ اِتنے مصروف تو نہیں تھے کہ انہیں جواب لکھنے کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی لیکن گھر میں جو نئی نویلی دلہن آ چکی تھی اُس کا رعب اِتنا غالب تھا کہ وہ کچھ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ نرملا کے ایک دو خط آئے تھے جن میں وہ رُوکھا پن اور تلخی تھا۔ گھنشیام کسی نہ کسی طرح اپنی پڑھائی جاری رکھنا چاہتا تھا لیکن نرملا نے مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

نینی تال آئے ہوئے بیس پچیس دن ہوئے تھے۔ نرملا کی بے رُخی نے گھنشیام کو پژمردہ کر رکھا تھا۔ وہ اکثر راتوں کو تنہائی میں رونے لگتا لیکن اُس نے سریش بابو کو کبھی کچھ نہیں بتایا۔ کبھی اپنی رام کہانی نہیں سنائی۔ یہ ٹھیک ہے کہ انہیں کچھ نہ کچھ معلوم تھا لیکن گھنشیام نے اپنی طرف سے کبھی کچھ بتانے کی کوشش نہیں کی۔

ایک دن اپنے کمرے میں داخل ہوا تو اُس نے دیکھا کہ اُس کی میز پر کچھ کتابیں رکھی

ہوئی تھیں۔ اُس نے اُنہیں دیکھنا شروع کیا۔ یہ ایف۔ اے کی کتابیں تھیں۔ گھنیشام حیران ہوگیا۔ سوچنے لگا کس نے انہیں یہاں رکھا ہے۔ خیال آیا کہ سرشتی بابو کے پریوار میں کوئی طالب علم آیا ہوگا۔ یہ خیال آتے ہی اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی ـــــ اُس نے سوچا ـــــ کاش اُسے بھی کتابیں میسر ہوں اور وہ بھی کالج کی تعلیم حاصل کرے۔

اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے گر پڑے۔

سنتوشتی معمول کے انداز سے اُچھلتی ہوئی کمرے میں داخل ہوگئی۔ ماسٹر جی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اُس نے سادگی سے پوچھا ـــــ "تم رو کیوں رہے ہو ماسٹر جی!"

گھنیشام نے مصنوعی ہنسی ہنستے ہوئے کہا ـــــ "نہیں تو۔"

اور پھر بچے کی توجہ ہٹاتے ہوئے اُس نے کہا ـــــ "یہ کتابیں کس کی ہیں؟"

"تمہاری ـــــ" سنتوشتی نے جواب دیا۔

"میری ـــــ؟" گھنیشام نے حیرانی سے کہا ـــــ "میں نے تو انہیں نہیں رکھا تھا۔"

"دیدی نے بازار سے منگوا کر رکھی ہیں ـــــ" سنتوشتی نے سنجیدگی سے کہا۔ "تمہیں اِن کی ضرورت تھی نا! اُنہوں نے بھیج دیں۔"

گھنیشام حیران رہ گیا۔ ساوتری اُس کی ہمدرد تو ضرور تھی اور وہ اُس کی بہت سی ضرورتیں پوچھے بغیر ہی خاموشی سے پوری کر دیتی تھی لیکن اُسے کتابوں کی ضرورت کا علم کیوں کر ہوگیا؟ اُس نے تو کبھی کسی سے اِس کا ذکر نہیں کیا تھا اور ساوتری کو کبھی اِس کا پتہ ہی نہیں ہوسکتا تھا!

وہ پریشان سا ہوگیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اُس نے کہا ـــــ "تمہاری دیدی کہاں ہے؟"

"باغ میں" ـــــ سنتوشتی نے مسکرا کر کہا۔ "اُسے بُلا لاؤں یہاں؟"

وہ دیدی کو بلانے کے لیے دوڑی تو گھنیشام نے اُسے دوڑ کر پکڑ لیا اور کہا "یہ تم سے کس نے کہا!"

"تو میں کیا کروں؟" سنتوشتی نے چلبلے انداز سے کہا۔

گھنیشام خاموش ہو گیا۔ پھر اُس نے سنتوش کو پیار کرتے ہوئے کہا ——— "دیدی سے کہہ دو کہ ہمیں اِن کتابوں کی ضرورت نہیں۔"

"کیوں ——— ؟" سنتوش نے سادگی سے پوچھا "تم ناراض ہو گئے ہو ماسٹر جی!"

ساوتری شاید باغ میں نہیں تھی۔ باہر کھڑی سُن رہی تھی۔ اُس نے بُلاکر کہا ——— "توشی اِدھر آؤ!"

گھنیشام چونک پڑا۔ اُس نے سنتوش سے کہا ——— "دیدی سے کہنا کہ کتابیں لے جائے ہمیں اِن کی ضرورت نہیں۔"

سنتوش بہن کی آواز سُن کر تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔ گھنیشام حیرانی سے کمرے کے اندر ہی کھڑا رہ گیا تھا۔ باہر نکل کر ساوتری سے اُسے بات چیت کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔

ساوتری شاید اُسے سُنانے کیلئے سنتوش سے کہہ رہی تھی ——— "ماسٹر جی سے کہہ دو کہ جو چیز ایک دفعہ خریدلی جاتی ہے وہ واپس نہیں کی جا سکتی۔"

گھنیشام نے کمرے سے باہر نکلے بغیر ہی جواب دے دیا۔ "میں خود ہی واپس کر دوں گا۔"

ساوتری نے شاید جواب سُن لیا تھا۔ اُس کے قہقہہ بُلند کرنے کی آواز آئی۔ وہ یہ کہتی ہوئی سنتوش کو لے کر تیزی سے باہر چلی گئی ——— "ماسٹر جی جنونی معلوم ہوتے ہیں ورنہ خواہ مخواہ نہ لڑتے۔"

ساوتری کو سنتوش کے ہمراہ دروازے کے سامنے تیزی سے گزرتے ہوئے گھنیشام نے دیکھ لیا تھا۔ اُس کے جی میں آیا تھا کہ وہ آواز دے کر ساوتری کو روک لے اور اُس سے پوچھے کہ اُس نے اُس کے لئے کتابیں کیوں خریدیں، لیکن اُسے ہمت نہیں ہوئی۔ ساوتری شاید مکان سے باہر جا چکی تھی۔ اُس نے دروازہ بند کر لیا اور کتابوں کو ایک ایک کر کے اُٹھا کر دیکھنے لگا۔

اُس کی دماغی حالت عجیب و غریب تھی۔ بہت سوچنے کے باوجود وہ سمجھ نہیں سکا

کہ اُس خاموش سی پُراسرار لڑکی کو اُس کے لئے کتابیں خریدنے کا خیال کیوں کر آیا۔ اُس نے کبھی اُس سے کھُل کر بات چیت تو نہیں کی تھی۔ پھر اُس نے اُس کے دِل کی بات کیوں کر بھانپ لی۔

اُس نے دِل ہی دِل میں ساوتری کا شکریہ ادا کیا۔۔۔ لیکن دوسرے لمحے اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ پھوٹ نکلا اور وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ اُسے یاد آ رہی تھی اپنی ماں کی جو اُس سے بے حد محبت کرتی تھی اور اُس کی کوئی فرمائش ٹالنے کا نام نہیں لیتی تھی۔

شام کو پڑھائی کے وقت ساوتری نہیں آئی۔ سنتوش سے پوچھا تو اُس نے کہا۔ "دیدی کی طبیعت ٹھیک نہیں اِس لئے وہ آج نہیں آئے گی۔"

گھنیشام چونک سا پڑا۔ اُس نے پوچھا۔۔۔ "تمہاری دیدی کو کیا تکلیف ہے بخار تو نہیں؟"

سنتوش کہہ رہی تھی۔۔۔ "اُن کا سر چکرا رہا ہے۔ کہتی تھیں آج ماسٹر جی سے کہہ دینا کہ میں آرام کروں گی۔"

گھنیشام خاموش تو ہو گیا لیکن اُس کا دِل نہیں لگا۔ اُسے ساوتری کا کبھی خیال نہیں آیا تھا۔ پہلے بھی وہ کئی مرتبہ نہیں آئی تھی لیکن اُس نے کبھی محسوس نہیں کیا لیکن آج نہ جانے کیوں وہ یہ چاہتا تھا کہ پڑھائی ختم ہو اور وہ اُسے دیکھنے جائے۔

لیکن پڑھائی ختم ہونے کے بعد بھی وہ اُس کے کمرے میں جا نہیں سکا۔ اُسے جرأت ہی نہیں ہوئی۔ بات یہ تھی کہ اگرچہ وہ اُس گھر میں اجنبی کی حیثیت سے نہیں رہ رہا تھا لیکن وہ سنتوش اور نوکروں کے سوا کسی سے کھُل کر بات چیت نہیں کرتا تھا اور ساوتری سے تو کھُل کر بات کرنے کی نہ تو اُسے جرأت ہوئی تھی نہ ہی خیال آیا تھا۔

دوسری صبح سکُول جانے سے پہلے اُس نے سنتوش سے پوچھا۔۔۔ "کہو تمہاری

تمہاری دیدی کا کیا حال ہے؟"

"اچھی ہیں۔" اُس نے اُچھلتے ہوئے کہا ــــ "کہتی تھیں ماسٹر جی سے کہنا کتابیں نہیں واپس کردیں۔"

گھنشیام پھر حیران ہوا۔ اُس نے پوچھا ــــ "اور کیا کہتی تھیں؟"

"کچھ نہیں۔" سنتوش نے کہا ــــ "اور وہ کتابیں اُٹھانے کے لئے کمرے میں داخل ہوگئی۔"

گھنشیام نے اب کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے مکان سے نکل کر سکول کی طرف چل پڑا۔ سکول میں خیال آیا۔ شاید ساوتری ناراض نہ ہوگئی ہو! ناراض نہ ہوتی تو اُس نے کتابیں واپس کیوں منگوا بھیجیں ــــ اور پھر وہ سوچنے لگا۔ اگر یہ ناراضگی بڑھ گئی تو شاید اُسے ملازمت سے برطرف کردیا جائے۔ پھر وہ کیا کرے گا۔ کہاں جائے گا۔ سوتیلی ماں نے تو لکھنؤ سے روانہ ہوتے ہی کہہ دیا تھا کہ وہاں گستاخی نہ کرنا ورنہ سریش بابو نے جواب دے دیا تو سنسار میں کوئی جگہ نہیں ملے گی ــــ وہ بے حد پریشان تھا اتنا پریشان کہ اُسے کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ جی چاہتا تھا کہ آج وہ جی بھر کر روئے۔ اِس ذہنی پریشانی کی وجہ سے وہ آج آدھی چھٹی کے وقت کھانا کھانے بھی نہیں گیا اور جب سکول بند ہوگیا تو دیر سے پہنچا۔

کمرے میں داخل ہوا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کتابیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک دن پہلے میز پر رکھی تھیں مگر آج لکڑی کے شیلف پر رکھی تھیں اور میز پر لکھنے کا سامان پڑا ہوا تھا۔

گھنشیام نے ایک کتاب اُٹھائی۔ کھولی تو اُس میں فونٹین پن سے سبز سیاہی سے "ماسٹر جی" کے لفظ لکھے تھے۔ ہینڈ رائیٹنگ سے اُسے پہچاننے میں دیر نہ لگی کہ لکھنے والی ساوتری ہی تھی۔

اُس نے دوسری کتابیں بھی ایک ایک کرکے کھولیں۔ سب پر "ماسٹر جی" لکھا تھا۔ کاپیوں کی بھی یہی حالت تھی۔ ایک رائیٹنگ پیڈ تھا اور اُس پر اُس کا پورا نام لکھا ہوا تھا۔

گھنشیام مسکرایا۔ اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اب کہ وہ پریشان نہ ہوا نہ ہی اُسے دوبارہ کتابیں واپس کرنے کا خیال آیا۔ لیکن وہ حیران تھا کہ یہ لڑکی بھی عجیب

معمہ ہے۔ خاموش رہنے کے باوجود اُس کے دِل میں ہمدردی کا اتھاہ سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔

شام کو پڑھانے گیا تو وہ اکیلی کتاب لئے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ گھنشیام سہم سا گیا۔ ساوتری نے بھی سر اٹھایا اور پھر کتاب کی طرف دیکھنے لگی۔

گھنشیام کے پاؤں کانپ رہے تھے۔ تاہم اپنے آپ پر قابو پاکر وہ آگے بڑھا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

ساوتری نے نمستے کرکے کتاب رکھ دی۔

گھنشیام نے کہا ــــ "تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

ساوتری ایک لمحہ کے لئے خاموش رہی۔ اُس نے ماسٹر جی کے سوال کا جواب دینے کی بجائے پوچھا ــــ "آج آپ کھانا کھانے کے لئے کیوں نہیں آئے؟"

گھنشیام کانپ اُٹھا۔ ساوتری نے اُس کی بات کا جواب دیئے بغیر اُس سے یہ سوال کیوں کیا تھا۔ اِس سے پہلے تو اُس نے کبھی کچھ پوچھا نہیں تھا۔ اُس نے کہا ــــ "یوں ہی سر چکرا رہا تھا اِس لئے۔"

ساوتری مسکرا دی۔ اُسے مسکراتا دیکھ کر گھنشیام بھی ہنس پڑا۔

ساوتری نے کہا ــــ "آپ خواہ مخواہ ناراض ہو گئے تھے کل۔ کتابیں میں نے تو نہیں بھیجی تھیں۔ پتا جی نے خود ہی منگوائی تھیں اور مجھے کہا تھا کہ آپ کے کمرے میں رکھ دوں۔ اِس پر آپ خواہ مخواہ ناراض ہو گئے۔"

"پتا جی سے کس نے کہا تھا ــــ؟" گھنشیام نے پوچھا۔

ساوتری خاموش رہی۔ گھنشیام سمجھ گیا کہ یہ تحریک اِس خاموش لڑکی کی ہی تھی۔ اگر یہ نہ ہوتا تو اُسے اُس کی کتابیں لوٹا دینے اور اُن پر اُس کا نام لکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

اور پھر کل کا سر درد بھی تو ایک بہانہ ہی تھا۔ شاید ساوتری کو اُس کی مظلومی پر ترس آگیا تھا اِس لئے وہ اُس سے اِس قدر دلچسپی کا اظہار کرنے لگی تھی ــــ گھنشیام غور و فکر کے عمیق سمندر میں ڈوب گیا۔

ساوتری کہنے لگی ـــــ "بابوجی کہتے تھے کہ ماسٹرجی کو پرائیویٹ طور پر کالج کا امتحان پاس کرلینا چاہیئے۔ کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو منگوالینا۔"

"تمہارے بابوجی کہاں ہیں؟" گھنشیام نے پوچھا ـــــ "میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"وہ لکھنؤ گئے ہوئے ہیں۔"

"کب آئیں گے؟"

"شاید ایک مہینہ لگ جائے۔"

گھنشیام خاموش ہوگیا۔ اُسے کوئی نیا سوال سوجھا ہی نہیں۔ حالانکہ وہ چاہتا تھا کہ وہ اِس دفعہ اُس خاموش لڑکی کے سینے میں چھپے ہوئے تمام راز معلوم کرلے۔

ساوتری نے اُسے خاموش دیکھا تو اُٹھ کھڑی ہوئی۔ گھنشیام اُسے روکنا چاہتا تھا لیکن ساوتری یہ کہتے ہوئے تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی کہ آپ صبح سے بھوکے ہیں۔ کچھ کھا لیجئے۔ آج ہم پڑھائی نہیں کریں گے۔

دُوسرا باب

کوئی ایک مہینہ بعد جب سریش بابو نے باتوں باتوں میں گھنشیام سے کہا تھا کہ "ساوتری بٹیا اُس کی بہت تعریف کرتی ہے" تو نہ جانے گھنشیام کے دِل میں کیوں جذبات کا طوفان اُمڈ پڑا تھا۔ وہ اُس گھر میں ایک معمولی ملازم ہی تو تھا۔ سریش بابو کے منشی ملازم اُس سے زیادہ تنخواہ پاتے تھے۔ اِس کے باوجود اِس گھر کے تمام آدمی اُس کی عزّت کرتے تھے۔ اور ساوتری تو نہایت خاموشی سے اپنے دل میں اُس کے لئے ہمدردی اور محبّت کے طوفان سنبھالے ہوئے تھے۔

ہفتہ دس دن پہلے کی بات تھی جب وہ شام کے وقت اپنے کمرے میں داخل ہوا تو ساوتری کو نوکر سے یہ کہتے سُنا تھا کہ — "ماسٹر جی کا پُورا پُورا خیال رکھا کرو۔ اُنہیں کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔"

اُسے دیکھ کر نوکر تو باہر چلا گیا۔ مگر ساوتری کھڑی رہی۔ گھنشیام نے مُسکراتے ہوئے کہا — "کیا آپدیش دیئے جا رہے ہیں؟"

ساوتری مُسکرا دی۔ کئی روز پہلے سے وہ دونوں آپس میں گھُل مِل گئے تھے اور ساوتری کو اُس سے مُسکرا کر بات چیت کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی تھی۔

گھنشیام نے کوٹ اُتارا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا — "بات دراصل یہ ہے کہ تم میرا جو اتنا خیال رکھتی ہو اُس سے مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔"

"کیوں؟" ساوتری نے شیلف پر سے ایک کتاب اٹھاتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا

"بات یہ ہے کہ....."

"آپ ہمیں اپنے سے بیگانہ اور دور سمجھتے ہیں"۔۔۔۔ ساوتری فقرہ مکمل کرتے ہوئے پھر مسکرادی اور پھر اُس نے کہا۔۔۔۔ "شاید آپ سمجھتے ہیں کہ میں آپ کی سوتیلی ماں کی کوئی لگتی ہوں۔ اِس لئے آپ کو مجھ سے نفرت ہے"

"یہ بات بھی نہیں"۔ گھنشیام نے سنجیدگی سے کہا۔

"تو پھر کیا اعتراض ہے ماسٹر جی؟"۔۔۔۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے آنکھیں چمکاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔۔۔۔ "یہ تو محض اخلاق اور انسانیت کا سوال ہے۔ ہم اِسے اپنا فرض سمجھتے ہیں"

اِس کے بعد کئی باتیں ہوئیں۔ ساوتری چلی گئی تو گھنشیام سوچنے لگا۔ کیا یہ محض اخلاق اور انسانیت کا سوال اور اُن کا فرض ہے؟ کیا یہ لوگ اپنے ہر ملازم سے اِسی طرح برتاؤ کرتے ہیں؟

اُس کے دِل نے کہا۔ اگر یہ درست ہوا تو اُسے افسوس ہوگا، صدمہ پہنچے گا۔ ورنہ ساوتری جس طرح اُس کے قریب آتی جا رہی تھی۔ اُس میں محض اخلاق اور انسانیت کا رنگ ہی تو نمایاں نہیں تھا بلکہ اخلاص، ہمدردی اور محبت بھی تو تھی۔ ساوتری کو اُس کا کتنا خیال تھا۔

اور وہ اُس کی کتابیں خود خرید کر لاتی تھی۔ اُس کے کمرے کی صفائی، سامان کی ترتیب اور کھانے پینے پر ذاتی توجہ دیتی تھی۔ اور جب کبھی اُسے اُداس دیکھتے تو اپنے چہرے پر مسکراہٹ لاکر اُس کی ذہنی پریشانی کو دُور کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ یہ سب کچھ محض اخلاق اور انسانیت کے جذبہ سے تو نہیں ہوتا۔

گھنشیام نے چونک کر کہا۔۔۔۔ "جی" شاید اُس نے سریش بابو کے فقرے کو سُنا ہی نہیں تھا۔

اور سریش بابو مسکراتے ہوئے کہے جا رہے تھے۔۔۔۔ "بات یہ ہے کہ ساوتری

کا دِل بہت نرم ہے۔ جب سے اُس کی ماں مری ہے بہت حساس ہوگئی ہے۔
گھنیشام کو اپنی ماں یاد آگئی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے گر پڑے۔

سریش بابو نے شاید اُنہیں دیکھا نہیں تھا۔ وہ کہے جا رہے تھے ـــــ "میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب دُوسری شادی نہیں کروں گا۔ دُوسری شادی لعنت ہوتی ہے۔ نئی عورت آجائے تو نہ جانے اِن سے کیا برتاؤ کرے۔"

گھنیشام کے منہ سے صرف "ہوں" کا لفظ نکلا۔

سریش بابو کہنے لگے ـــــ "اِس وقت ساوتری اور سنتوش ہی میرے لئے سب کچھ ہیں۔ لوگ کہتے ہیں لڑکا نہیں لیکن لڑکا ہوتا تو کیا ہو جاتا اور آج کے لڑکوں پر اعتبار بھی کیا ہے۔"

گھنیشام کو یہ گفتگو کچھ اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ اُس نے اِس بات کا رُخ بدلنے کے لئے کہا ـــــ "سکول کے متعلق کیا رائے ہے۔ ٹھیک چل رہا ہے نہ؟"

سریش بابو اپنی ہی دُھن میں بہے جا رہے تھے۔ کہنے لگے ـــــ "تمہاری کوشش سے اگر ساوتری پڑھ لکھ جائے تو اُسے معمولی پریوار میں بیاہ دُوں گا۔ بڑے گھرانوں کو تو میں پسند ہی نہیں کرتا۔ غریب گھرانا ہوگا تو لڑکی بھی سُکھی رہے گی اور پھر بیٹے کی حسرت بھی پُوری ہو جائے گی۔"

اپنی نشست سے اُٹھتے ہوئے اُنہوں نے حُقّے کا ایک کش لگایا اور کہنے لگے ـــــ "ساوتری چاہتی ہے کہ تم بھی جی لگا کر کالج کی تعلیم حاصل کر لو۔ بی۔ اے پاس کر لو تو زندگی بن جائے گی۔"

سریش بابو ایسے وقت کمرے سے باہر نکلیں تو اُن کی منزلِ مقصود تالاب کا کنارہ ہی ہوتی تھی۔ وہ چھڑی لے کر ٹہلتے ہیں۔ مزدوروں سے بات چیت کرتے ہیں۔ اُن کا دُکھ سُکھ پُوچھتے ہیں۔ پھر کھیتی باڑی کا ذکر ہوتا ہے اور اگر وقت مِل جائے تو ڈھلتے ہوئے سورج کی لال لال کرنوں میں کشتی کی سیر کا لُطف بھی اُٹھاتے ہیں۔

اُن کے جانے کے بعد گھنیشّام اپنے خیالات میں محو تھا کہ اچانک آئینے میں اُس نے دیکھا کہ پیچھے سے مُسکراہٹ چھپاتی ہوئی دبے پاؤں ساوتری کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ گھنیشّام نے مُڑ کر دیکھا تو وہ کھِلکھلا اُٹھی۔ مگر گھنیشّام کے چہرے پر ہنسی نہیں آئی۔

ساوتری نے پُوچھا ـــــ خاموش کیوں ہیں ماسٹر جی؟ اُداسی کا کارن کیا ہے؟

"نہیں تو" گھنیشّام نے جواب دیا ـــــ "سوچ رہا تھا کہ تمہارے پتاجی جو اتنے احسان کر رہے ہیں اُن کا بوجھ بھی کبھی اُتار سکوں گا یا نہیں"

"تو یہ بات ہے" ساوتری نے مُسکراتے ہوئے کہا ـــــ "آج پھر بھُوت سوار ہو گیا"

"یہ بات نہیں" گھنیشّام نے سنجیدگی سے کہا ـــــ "بات دراصل یہ ہے کہ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ پچھلے جنم میں شاید ہم ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ شاید اِسی لیئے قدرت مجھے اپنے ماں باپ سے چھُڑا کر تمہارے اِتنے قریب لا رہی ہے"

ساوتری کُرسی پر بیٹھ گئی۔ اُس نے کہا ـــــ "پچھلے جنم کی باتیں تو میں نہیں جانتی۔ اور پھر یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ انسان مر کر پھر جنم لیتا ہے یا نہیں لیکن اِتنی بات ضرور ہے کہ زندگی میں انسان کو جو ماحول ایک مرتبہ مِلتا ہے ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ برقرار رہے"

"تمہارا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آپ کی طرح مجھے بھی اپنی ماں سے محبّت تھی لیکن ممتا کا وہ چشمہ ختم ہو گیا۔ آپ یہاں آکر ہم لوگوں کے دِلوں کے قریب آ گئے۔ یہ قدرت کا کھیل ہی تو ہے کل نہ جانے کیا ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ ماحول بھی اِسی طرح رہے"

گھنیشّام کو ایسے لگا گویا کِسی نے دماغ پر ہتھوڑے سے ضرب لگا دی ہو کیونکہ آج تک اُسے کبھی یہ اندیشہ نہیں ہوا تھا کہ یہ ماحول بھی بدل سکتا ہے۔ ساوتری اُس کی کچھ لگتی تو نہیں تھی۔ پھر بھی اُس خاموش سی لڑکی نے اپنے دِل میں ہمدردی کے نہ جانے کِتنے طوفان چھپائے رکھے تھے۔ اِس سے اُسے ایک گونہ سکون حاصل ہوتا تھا۔ ساوتری کی آج کی باتوں سے اُسے دھکّا لگا۔ اُس نے سوچا۔ کیا یہ سکون بھی چھِن جائے گا۔

اُسے خاموش دیکھ کر ساوتری نے پوچھا ــــ "کیا آپ کو اتفاق نہیں میری بات سے؟"

"بات تو درست معلوم ہوتی ہے" گھنشیام نے کہا ــــ "لیکن کیا تم واقعی....؟"

اِس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

ساوتری ایک سوالیہ فقرہ بن کر کھڑی رہی۔ شاید وہ یہ مقولہ سمجھ ہی نہیں سکی تھی۔ شاید اُسے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کیا کچھ کہہ گئی ہے۔

ایک لمحہ خاموش رہ کر اُس نے جب دیکھا کہ گھنشیام اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہا ہے تو اُس نے مسکراتے ہوئے کہا ــــ "آپ تو واقعی گہری سوچ میں پڑ گئے ہیں"

گھنشیام کا سلسلۂ خیالات ٹوٹ گیا تھا۔ اُس نے رُک رُک کر کہا ــــ "بات دراصل یہ ہے کہ میں بہت بدقسمت ہوں۔ بہت بدنصیب۔ سوچتا ہوں کہ اگر تم لوگوں نے بھی چھوڑ دیا تو نہ جانے مجھے کتنا صدمہ پہنچے گا" ــــ اب کے وہ آنسوؤں کے بہاؤ کو نہ روک سکا

ساوتری کانپ اُٹھی۔ اُسے یہ خیال بھی نہ تھا کہ ماسٹر جی یہ باتیں سوچ رہے ہیں۔ وہ خاموشی سے کھڑی رہی۔ کیا جواب دے؟ اُسے کچھ سوجھا ہی نہیں۔

گھنشیام بھی خاموشی سے بیٹھا رہا۔

ساوتری نے آنسوؤں کے قطرے زمین پر گرتے دیکھے تو اُس کے جسم میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ اُس نے کہا ــــ "کشما کرنا! میری باتوں سے آپ کو بہت دُکھ ہوا ہے، مگر میں نے اپنی دانست میں دِل دُکھانے والی بات تو نہیں کی"

گھنشیام نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ــــ "ایک بات پوچھوں بتاؤ گی؟"

"فرمایئے"

"کیا تمہیں مجھ سے محبت ہے؟"

ساوتری کانپ اُٹھی۔ محبت! اُس نے یہ بات تو کبھی سوچی ہی نہیں تھی۔ اُسے معلوم ہی نہیں تھا کہ محبت کیا چیز ہوتی ہے۔ قصّہ کہانیوں سے تو وہ یہی سمجھی تھی کہ محبت کوئی بہت گندی چیز ہے۔

اُس کے پاؤں کانپنے لگے۔ اُس کا سر چکرانے لگا ــــ! اور پھر اچانک یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گئی کہ ــــ "مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں کچھ نہیں جانتی!"

گھنشیام بھونچکا سا رہ گیا۔ وہ کچھ دیر تک بُت کی طرح خاموش بیٹھا رہا۔ اِس کے بعد وہ آہستہ آہستہ باہر نکل گیا۔

ایک اور پریشانی ہی تو تھی۔ ایک اور مصیبت! اُس نے کھانا نہیں کھایا! سریش بابو نے کہلا بھیجا تو اُس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اُس کے سر میں درد ہے۔ نوکر اسپرین لے کر آیا۔ اُس نے رکھ لی لیکن نہ تو چائے پی نہ ہی اسپرین کھائی۔

ایک روز پہلے ہی ماں کا خط آیا تھا۔ اُس نے لکھا تھا ــــ "میری طبیعت اچھی نہیں ہم ہر دوار جا رہے ہیں۔ وہاں سے کچھ دن کے لئے بمبئی جانے کا ارادہ ہے۔ تمہیں تو گھر کا خیال ہی نہیں۔ تم نے ایک پیسہ بھی نہیں بھیجا۔ اگر تم اپنی شادی کے لئے روپیہ اکٹھا نہیں کرو گے تو کل کلاں کون لڑکی دے گا؟"

گھنشیام نے چٹھی پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ یہ بھی عجیب عورت ہے۔ اِس کے پاس سیر و تفریح کے لئے روپیہ ہے۔ اُس کے باپ کی کمائی بھی عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہی ہے مگر اُسی باپ کے بیٹے کے لئے کچھ بھی نہیں! اور پھر وہ شادی.... اُس نے نفرت سے ناک سکیڑی۔ شادی ایک مصیبت ہے۔ مجھے شادی کی ضرورت بھی کیا ہے اور پھر اِس سنسار میں میرا کون ہے!

اور پھر اُسے ساوتری کا خیال آیا۔ آج نہ جانے کیوں وہ اُس کے ایک سیدھے سادے سوال پر بگڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اُس نے سوچا کیا اُس کی ہمدردی محض ایک دکھاوا ہے۔ اگر نہیں تو عزت کے نام پر وہ بگڑ کر کیوں چلی گئی۔ اُس نے کوئی بُری بات تو نہیں کہی تھی۔

انسانی فطرت ہے مناسب وقت پر وہ انسان کو سب کچھ بتا دیتی ہے۔ جو سوسائٹی نہیں بتاتی۔ کتابیں اور سکول نہیں بتاتے ــــ وقت کی رفتار بجائے خود ایک سکول ہے جس میں انسان سب کچھ سیکھ جاتا ہے۔

ساوتری کو گھنیشام سے ہمدردی تھی۔ گھنیشام کو بھی اِس کا پاس تھا۔ احساس تھا۔ آج یہی احساس اُس کے دِل میں طوفان پیدا کر رہا تھا۔ ایسے طوفان جن میں ساوتری اُسے ایک معصوم دیوی سی نظر آنے لگی تھی۔ جِس کی پوجا کرنے کے لئے اُس کے دِل میں اُمنگیں پیدا ہو رہی تھیں۔ آگ سی لگ رہی تھی اور وہ سوچتا تھا کہ کیا یہ آگ بجھنے کی یہی صورت ہے کہ ساوتری اُس کی نگاہوں کے سامنے کھڑی رہے۔

شاید یہی محبّت کی ابتدا تھی۔ شاید یہی ایک احساس تھا جو اُس کے دِل میں طوفان بن کر اُٹھ رہا تھا۔

ساوتری کی کیا حالت تھی یہ تو کوئی نہیں جانتا اور کوئی جانے بھی کیونکر جبکہ کوئی اُس کے دِل میں گہرائیوں میں چھپے سمندروں میں غوطہ زن ہوا ہی نہیں تھا۔

اُس نے رائیٹنگ پیڈ کھولا اور لکھنے لگا۔

"ساوتری!

نہ جانے کیوں میرے دِل میں طوفان اُمڈ رہے ہیں۔ نہ جانے تم کب مجھ سے روٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ کیا میں اِتنا ابھاگا ہوں کہ ماں باپ کی محبّت سے محروم ہونے پر سنسار میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں رہی۔ اگر میری زندگی یہی ہے تو مجھے مر جانے دو۔ اگر میرے لئے سنسار میں کوئی جگہ ہی نہیں رہی تو میں خود ہی خاموشی سے یہاں سے چلا جاؤں گا۔ تم صرف ایک بار مسکرا کر ملو۔ اِس کے بعد تم سے کچھ نہیں کہوں گا۔ کوئی شکایت نہیں کروں گا۔ آپ سے آپ ہی دُور بہت دُور چلا جاؤں گا"

گھنیشام

یہ خط لکھ کر اُس نے وہیں رہنے دیا۔ دماغ چکّرا رہا تھا۔ کچھ تو بھوک کی وجہ سے اور کچھ آج کے واقعات کی وجہ سے۔ کمرے کی بجلی گُل کرنے کے بعد وہ پریشانی سے ٹہلنے لگا اور نہ جانے کب لیٹا اور سو گیا۔

تیسرا باب

زندگی ایک عجیب کھیل ہے جو انسانوں کو کھلاڑی بنا دیتی ہے۔ کوئی چاہے یا نہ چاہے زندگی اُسے پٹے راستوں پر لے ہی جاتی ہے

کوئی ایک سال پہلے گھنشیام نے بھولے پن میں ذہنی پریشانی سے مجبور ہو کر مطلب نہ سمجھتے ہوئے بھی ساوتری کو ایک بے تُکی سی چٹھی لکھی تھی۔ دوسرے دن ہی ساوتری اُس کی غیر حاضری میں اُس کے کمرے میں آئی تو یہ چٹھی دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اُس وقت اُس کے دل پر کیا گذری تھی یہ تو کسی کو معلوم نہیں لیکن جانے کیوں اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور اُس کا دل رو اُٹھا۔ شاید اُس نے سوچا تھا کہ اُس نے کوئی غلطی کی تھی۔ اِس لئے ماسٹر جی ناراض ہو کر یہاں سے چلے جانا چاہتے ہیں۔ اُس نے سوچا کہ اپنے پتا جی سے ذکر کرے۔ لیکن دوسرے لمحے خیال آیا کہ یہ کونسی بڑی بات ہے۔ ماسٹر جی پرائے آدمی تو ہیں ہی نہیں۔ پہلے بھی اُن پر کئی بار جنون سوار ہوا تھا تو وہ اُنہیں منا لیتی تھی۔ اُس نے چٹھی کے نیچے ہی لکھ دیا۔

"ماسٹر جی!

آپ تو خواہ مخواہ جنون کی حد سے گذر رہے ہیں۔ ساوتری سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو اُسے کھشما کر دینا چاہیئے۔ آپ بڑے ہیں اور میں چھوٹی۔ میرے کارن آپ کو تکلیف ہو یہ تو میں خود بھی برداشت نہیں کر سکوں گی"۔

کتنی سادگی تھی اِن جذبات میں۔ کتنا بھولا پن تھا اِس خط میں اور جب ماسٹر جی نے ساوتری کو کمرے میں بیٹھے ہوئے کتاب پڑھتے ہوئے دیکھا تو پہلے تو وہ وہیں سے لوٹ جانا چاہتے تھے لیکن جب میز پر اپنے ہی خط کے نیچے کچھ لکھا دیکھا، پڑھا اور نہ جانے کیوں اُن کا دل خوشی سے جھوم اُٹھا۔

ساوتری مُسکرادی تھی اور گھنیشام کے دِل میں ایک ساتھ کتنے طوفان ناچ اُٹھے تھے۔ اُسے ایسا لگا تھا گویا محبت کی دیوی کے سامنے کھڑا ہے یا جس دولت کیلئے اُس نے برسوں تپسیا کی ہو۔ وہ خود بخود اُس کے نزدیک آگئی ہو۔ اور پھر کئی مہینے بعد ایک دن جب وہ سویا ہوا تھا اور ساوتری نے اُسے گدگدانا شروع کر دیا تھا تو اُس نے بُرا نہیں مانا تھا۔ ساوتری کی سادگی کے باوجود نہ جانے کیوں وہ چاہتا تھا کہ وہ اُسے گدگدائی رہے۔ اُس کے جسم میں بجلی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اُس روز پہلی بار اُس نے ساوتری کے ہاتھ کو چُھوا لیا تھا۔ ساوتری پہلی بار چونک پڑی تھی۔ اُس کے چہرے پر سیاہی سی پھیل گئی تھی۔ لیکن اُس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ شاید اُسے کہنے کی جرأت نہیں تھی۔ شاید اُسے ڈر تھا کہ ماسٹر جی پر پھر جنون سوار ہو جائے گا۔ اِس کے بعد کئی دن اور گزر گئے زندگی وقت کی رفتار سے ہی چلتی رہی۔ کئی راستے آئے اور اُکھڑے ہوئے نقش بن کو ذہن پر رہ گئے۔

گھنیشام اور ساوتری کو یاد ہی نہیں ہیں محبت کی ابتدائی پہیلیاں۔ گھنیشام اُس گھر میں جب پہلے دِن آیا تھا جب اُس نے پہلی بار ساوتری کے لئے محبت کا جذبہ محسوس کیا تھا۔ پہلی بار جو خلش محسوس ہوئی تھی اور خلش کے بعد جن حسین تصوّرات میں بدل گئی تھی اُس کی تفصیل اب اُنہیں یاد ہی نہیں رہی تھی۔ اتنی ہی یاد تھی کہ وہ دونوں ایک دُوسرے سے محبت کرتے ہیں اور انسانی فطرت نے اُنہیں یہ بھی سکھا دیا تھا کہ محبت خاموشی سے اور مخفیہ طور پر کی جاتی ہے۔ کسی کو پتہ لگ جائے تو بدنامی ہوتی ہے رُسوائی ہوتی ہے۔

تاش کھیلتے ہوئے ایک روز گھنیشام جیت گیا تھا۔ جیت بادشاہ کے پتے نے

دلائی تھی۔ ساوتری کی بیگم ہار گئی تھی۔ گھنشیام نے خوشی سے اُچھلتے ہوئے کہا۔ تم جیون بازی میں ہار گئیں۔ میں جیت گیا۔ ساوتری شرم سے مسکرا دی۔ شاید اِن فلسفیانہ باتوں کو سمجھ نہیں پائی تھی کہ گھنشیام نے بڑھ کر اُسے چوم لیا۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر وہ گئی اور بگڑ کے کمرے سے باہر نکل گئی۔ گھنشیام خوف سے کانپ اُٹھا۔ وہ سوچنے لگا۔ اب کیا ہوگا۔ اگر ساوتری نے سریش بابو سے شکایت کر دی تو اِس کا نتیجہ کیا ہوگا لیکن یہ دن بھی یونہی گزر گئے۔ ساوتری نے نہ تو شکایت کی تھی نہ ہی اِس کے بعد اُس سے کوئی جھگڑا کیا تھا۔ اُسی رات اُسے ایک رقعہ ملا تھا جس میں لکھا تھا۔ ...

ماسٹر جی!

آپ نہ معلوم کیا سوچ رہے ہیں۔ نہ معلوم آپ پر کیا جنون سوار ہو رہا ہے۔ آپ بڑے ہیں میں چھوٹی۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ کو کوئی دُکھ ہو۔ آپ پریشان ہوں۔ لیکن میں تو پریشان ہو رہی ہوں آپ کا جنون دیکھ کر میں تو کانپ اُٹھتی ہوں۔ مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی۔ کیا محبت یہی ہے۔ کیا ہمدردی یہی ہے۔ اُف!

ساوتری

گھنشیام نے اُس وقت کیا سوچا تھا اور اُس کے بعد پہلی ملاقات کے وقت ساوتری کے من کی کیا دشا تھی۔ گھنشیام کو آج اِتنے دنوں بعد اِس کے متعلق کچھ یاد نہیں رہا۔ اِتنا ہی معلوم تھا کہ اُس کے اور ساوتری کے درمیان کئی دیواریں ایک ایک کر کے ٹوٹ رہی تھیں اور وہ ایک دوسرے کے قریب بہت قریب ہوتے جا رہے تھے۔

سریش بابو کو کچھ معلوم تھا یا نہیں یہ تو کوئی نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ کسی نے اُن سے پوچھا بھی تو نہیں تھا۔ نہ ہی اُنہوں نے کسی سے ذکر کیا تھا۔ البتہ اُنہوں نے اپنے چچازاد بھائی رائے بہادر جوگیش چندر کو جو بمبئی میں سالیسٹر کا کام کرتے تھے، خط لکھا۔ اُنہوں نے شکایت کی تھی کہ وہ تین مہینہ سے بمبئی نہیں آئے۔

سریش بابو نے اُنہیں جو خط لکھا اُس میں دوسری باتوں کے علاوہ گھنشیام کا ذکر بھی کر دیا تھا۔ اُنہوں نے لکھا ——— عجیب قسم کا لڑکا ہے۔ باپ بیرسٹر ہے اور اِس

کے سوا کوئی اولاد نہیں۔ پھر بھی دُوسری بیوی کے چکر میں ایسا پھنسا ہے کہ اپنے لڑکے کو بھُول گیا ہے اور یہ لڑکا! کتنا ہونہار ہے۔ ایک سال میں ہی اس نے ایف اے پاس کرلیا ہے اور اب بی۔ اے کی تیّاریاں کر رہا ہے۔ اِتنا نیک، ملنسار اور شریف لڑکا تو میں نے آج تک دیکھا نہیں۔

آجکل ساوتری اُنہی سے پڑھ رہی ہے۔ خیال ہے اگلے سال میٹرک کا امتحان پاس کرلے گی۔"

رائے بہادر جگیش چندر سالسٹر ہونے کی وجہ سے بڑے زمانہ ساز تھے۔ سریش بابو کے خط میں شاید اُنہیں گھنیشام سے سریش بابو کی غیر معمُولی دلچسپی نظر آئی۔ اُنہوں نے فوراً ہی جواب دیا:۔

"میرا خیال ہے تم ساوتری کو یہاں بھیج دو۔ یہاں انگریزی کے بہت اچھے سکُول ہیں۔ کُسُم بھی ایک ایسے ہی سکُول میں پڑھتی ہے۔ گھر میں پڑھائی سے لڑکی امتحان تو پاس کرلیتی ہے مگر ذہین نہیں ہوسکتی۔ اُس کی معلُومات میں اضافہ نہیں ہوتا۔"

اور پھر اُنہوں نے گھنیشام کا ذِکر بھی کیا۔ اُنہوں نے لِکھّا تھا:۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تم اُس نوجوان میں غیر معمُولی دلچسپی کا اظہار کر رہے ہو۔ بدنصیب لڑکے سے ہمدردی کا اظہار کرنا تو بُرا نہیں، مگر اتنی غیر معمُولی دلچسپی شاید تمہارے اور اُس کے لئے فائدہ مند نہ ہو۔"

سریش بابو اِتنے تجربہ کار ہونے کے باوجود اِن لفظوں کا مطلب نہیں سمجھ سکے۔ اُنہیں ساوتری کو بمبئی بھیجنے کی تجویز معقول نظر آئی۔ لیکن اُن کے دل میں یہ بھی خیال آیا کہ وہ اپنی لڑکی سے بے حد محبّت کرنے کے سبب الگ نہیں رہ سکیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ اُنہوں نے ساوتری سے اس خط کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ تاہم جب رائے بہادر نے ایک اور خط لِکھّا اور اُس میں کُسُم نے بھی ساوتری کو بمبئی آنے کے لئے لِکھا، تو سریش بابو نے ساوتری کو بُلا کر اُس کی رائے لینا بھی ضرورّی سمجھا۔ ساوتری کو کُسُم کا خط دیتے ہوئے اُنہوں نے کہا۔ "آجکل بمبئی میں موسم بہت اچھّا ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے

کر تمہیں وہیں بھیج دوں۔"

ساوتری کسم کا خط پڑھنے میں مصروف تھی۔ اُس نے سریش بابو کی بات نہیں سنی۔ اس لئے اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

سریش بابو نے کہا۔ "تمہارے چچا کا خیال ہے کہ تمہیں انگریزی سکول میں داخل کر دیا جائے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

ساوتری کو اختلاف نہیں تھا بلکہ اُسے یہ تجویز پسند آئی۔ نینی تال کی نسبت اُسے بمبئی پسند تھا۔ بمبئی کا صاف ستھرا شہر، ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، منٹ منٹ کے بعد مل جانے والی بسیں۔ اور پھر کسم کا سکول۔ تمام منظر اُس کی آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ اُس نے مسکرا کر کہا۔ "ٹھیک ہی تو ہے۔ آپ مجھے وہاں بھیج دیں۔ میں سکول میں داخل ہونا چاہتی ہوں۔"

جانے کیوں سریش بابو کو انکار نہ کرنے کے باوجود ساوتری کا یہ جواب پسند نہیں آیا۔ شاید یہ بیٹی سے اُن کی جگری محبت کا نتیجہ تھا۔ تاہم اُن سے بھی زیادہ دُکھ ایک اور شخص کو ہوا اور وہ ہکا بکا رہ گیا۔

ساوتری اور سریش بابو میں کافی بات چیت ہوئی تھی۔ سریش بابو نے کہا تھا کہ رائے بہادر چند دن خود نینی تال آنا چاہتے ہیں۔ نہ آئے تو وہ خود اُسے بمبئی لے کر جائیں گے اور ممکن ہوا تو کچھ دِن وہاں ٹھہریں گے بھی۔

ساوتری نے بھی اِس پر پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اور جب سریش بابو اپنے دفتر میں منیجر سے معمول کی بات چیت کرنے لگے تو ساوتری تتلی سی بنی ہوئی ہوا کے دوش پر اُڑی ہوئی سی ساڑھی کے پلّو کو پھڑ پھڑاتی ہوئی گھنیشام کے کمرے میں داخل ہوئی۔

گھنیشام نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آؤ!" اور جب وہ اُس کے نزدیک آئی تو گھنیشام نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دباتے ہوئے کہا ——— "آج تو چاند ستاروں کو ماند کر رہی ہو۔"

ساوتری نے مسکرا کر اِس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ کسم کا خط اُس کے ہاتھ

ہنس دیتے ہوئے کہنے لگی ——— "میں بمبئی چلی جاؤں؟ وہاں ایک اچھا انگریزی سکول ہے کسم بھی وہاں ہی پڑھتی ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ مجھے بھی اُس سکول میں داخل ہو جانا چاہئے"۔

گھنیشام چونک اُٹھا۔ اُسے سخت چوٹ لگی تھی۔ اُسے محسوس ہوا گویا ایک ساتھ کئی بجلیاں ٹوٹ پڑی ہوں۔ وہ ہکّا بکّا رہ گیا اور ساوتری کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

ساوتری اب بھی مسکرا رہی تھی۔ اُس نے کہا ——— "آپ کو تو یہ تجویز بہت اچھی لگی ہوگی۔ میں انگریزی سکول میں پڑھوں گی۔ جہاز کی سیر کروں گی۔ بمبئی اچھا شہر ہے۔ بہت صاف ستھرا اور کسم تو بہت اچھی لڑکی ہے"۔

جذبات کے بہاؤ میں وہ ایک ساتھ کتنی ہی باتیں کہہ گئی۔ گھنیشام پریشانی سے بیٹھا سُن رہا تھا۔ ساوتری نے یہ دیکھا تو سنجیدگی سے کہنے لگی ——— "کیا خیال ہے آپ کا پتا جی بہت زور ڈال رہے ہیں"۔

"محض پتا جی زور ڈال رہے ہیں یا ...."

"فرض کرو میرا بھی یہی خیال ہو تو ....؟" اُس نے سوال پورا کر دیا۔

وہ ایک لمحہ کے لئے خاموش رہا۔ اِس کے بعد اُس نے کہا ——— "تو پھر مجھ سے یہ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں کون ہوں تمہارا!"

ساوتری خاموشی سے کھڑی تھی۔ اُس کے چہرے پر نہ جانے سیاہی سی کیوں پھیل گئی۔ اُس نے کہا ——— "آپ ہمارے ساتھ کیوں نہیں چلتے؟"

"میں؟" اُس نے پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا ——— "میں تم لوگوں کا کیا لگتا ہوں"۔

ساوتری سہم گئی۔ اُس نے کہا ——— "آپ کو اعتراض ہے کیا؟"

گھنیشام نے کہا ——— "مجھے؟ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے اور پھر میں اعتراض کروں بھی تو کیا تم رُک جاؤ گی؟"

ساوتری واقعی رُکنا نہیں چاہتی تھی۔ اِسی لئے وہ خاموش رہی۔ اُسے کیا معلوم

تھا کہ اس تجویز کا گھنشیام پر کیا اثر ہوا ہے۔

گھنشیام کی آنکھوں سے آنسو بہنا چاہتے تھے۔ جذبات کے بہاؤ کو روکتے ہوئے وہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ساوتری پاگلوں کی طرح اُسے دیکھ رہی تھی۔ گھنشیام ٹہلنے لگا۔ اُس کے دل میں نہ جانے کتنے طوفان اُٹھ رہے تھے۔ لیکن ساوتری بمبئی کے خوشنما منظر کے تصور میں کھوئی ہوئی اُن طوفانوں کا احساس نہ کر سکی تھی۔

اُس نے کہا ــــ "چائے منگواؤں آپ کے لئے؟"

گھنشیام نے کہا ــــ "چائے نہیں زہر لادو۔"

"آپ کو ہو کیا گیا ہے؟" ساوتری نے اپنے لبوں پر مصنوعی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا

گھنشیام رُک گیا۔ اُس نے ساوتری کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ اُس کے ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے اور جسم کانپ رہا تھا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُس نے کہا ــــ "مجھ سے پوچھتی ہو کہ تجھے کیا ہو گیا ہے۔ تجھے برباد کر کے اب بمبئی بھاگ جانا چاہتی ہو۔ میرے ہاتھ میں زہر کا پیالا دے کر پوچھ رہی ہو کہ زہر میٹھا ہے یا نہیں، تم.... تم...."

ساوتری کانپ اُٹھی۔ گھنشیام کی نگاہوں میں پاگل پن تھا اور اُس کی آواز میں دنیا کی سی وحشت۔ وہ اتنی سہم گئی تھی کہ نہ تو چلا سکی نہ اپنے آپ کو اُس کی گرفت سے آزاد کرا سکی۔

گھنشیام کہے جا رہا تھا ــــ "تجھے خواب میں بھی وہم نہیں ہوا تھا کہ پہلے تو مجھے اپنی حسین مسکراہٹ سے پاگل بناؤ گی محبت کے وعدے کرو گی اور اس کے بعد مجھے تن تنہا چھوڑ کر بھاگ جاؤ گی۔"

اور پھر اس زور سے اُسے جھٹکا دیتے ہوئے کہا ــــ "اگر تم واقعی چاہتی ہو کہ میں مر جاؤں تو میں مر جاؤں گا۔ یقین رکھو کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی۔ تم چلی جانا مسکراتے ہوئے بمبئی، تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔"

ساوتری کو جھٹکا جو لگا تو وہ کرسی پر گر پڑی۔ کرسی لڑکھڑائی اور زمین پر گر پڑی۔ اُس کی چیخ نکل گئی۔

گھنشیام کانپ اُٹھا۔ کیونکہ کرسی کے گرنے اور ساوتری کی چیخ کی آواز سن کر

سریش بابو اور نوکر دونوں بھاگ کر کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔

سریش بابو نے پوچھا ــ "کیا ہو گیا؟"

گھنیشام کے بدن میں کاٹو تو خون نہیں تھا۔

ساوتری نے اُٹھتے ہوئے ہنس کر کہا ــ "کچھ نہیں۔ تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی تھی کہ کرسی پر گر پڑی۔ اِس لئے....."

سریش بابو نے بیٹی کو پیار کیا۔ وہ ابھی تک سہمی ہوئی تھی اور گھنیشام بت بن کر خاموشی سے کھڑا تھا۔

ساوتری سریش بابو کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی۔ معلوم نہیں اُس نے گھنیشام کو دیکھا بھی تھا یا نہیں +

چوتھا باب

بھول ہوگئی تھی واقعی! گھنشیام نے ساوتری کے چلے جانے پر دل ہی دل میں سوچا کیا واقعی اُسے اِتنا حق تھا کہ وہ ساوتری سے اِس طرح بدسلوکی کرے۔ اُس نے رائے ہی تو دریافت کی تھی۔ وہ کہہ دیتا کہ بمبئی جانا ٹھیک نہیں۔ شاید سمجھانے سے وہ مان بھی جاتی اور اگر بمبئی جانے پر اصرار کرتی تب بھی اُن کی محبت تو قائم رہتی۔ ناراضگی اور جھگڑا نہ ہوتا اور اب تو صورت دیکھنے کی بات بھی نہیں رہے گی۔ جسے تمام ہمدردیاں اور خلوص دِلی کے باوجود اُس نے بُرا بھلا کہا اور ذلیل کیا۔ اُس نے اُس سے انتقام نہیں لیا۔ پتا جی سے اُس کے خلاف کوئی شکایت تو نہیں کی۔ لیکن اب وہ اُس سے ہمدردی کیوں کرے گی۔

گھنشیام کا سر چکرانے لگا۔ اُس نے سوچا۔ اب ساوتری بمبئی چلی ہی جائے گی۔ اُس سے کبھی بات بھی نہیں کرے گی۔ لیکن کیا وہ یہ صدمہ برداشت کر سکے گا۔ کیا وہ بھی ساوتری کو بھول سکے گا۔ ساوتری نہ صرف اُس سے محبت کرتی تھی بلکہ اُس کی محسن بھی تھی۔ اُس نے سخت غلطی کی کہ اُس دن اُسے ذلیل کیا۔

اُس کی آنکھوں سے آنسو اُبل آئے۔

دوسرے روز جب پڑھائی کا وقت آیا تو وہ جان بوجھ کر دیر سے پہنچا۔ کیونکہ اُس کا ضمیر اُسے ملامت کر رہا تھا اور اُسے ساوتری سے آنکھیں ملانے کی ہمت نہیں تھی۔ ساوتری

اپنی بہن کے ساتھ .... بیٹھی ہوئی کوئی مذاق کر رہی تھی۔ دونوں بہنیں ایک ساتھ کھلکھلا اٹھی تھیں۔ لیکن گھنیشام کے آتے ہی ساوتری خاموش ہو گئی اور آٹھ کر نگاہیں اُٹھائے بغیر اس نے سنجیدگی سے "نمستے" کہی اور پھر کرسی پر بیٹھ گئی۔

من پاپی ہو تو کوئی بہانے بنا لیتا ہے۔ گھنیشام نے سوچا۔ آج بھی یہ آ تو گئی۔ اس نے اس کے خلاف کوئی شکایت بھی تو نہیں کی۔ بلکہ کل کی چوٹ کی ذمہ داری بھی اپنے اُوپر لے کر اُسے صاف طور پر بچا دیا۔ اور آج .....

اُسے ایک تدبیر سوجھی۔ اس نے انگریزی میں ترجمہ کا امتحان لینا شروع کیا۔ امتحان کیا تھا۔ ساوتری کی محبت کی آزمائش۔ اس نے خود ہی اس کی سلیٹ پہ لکھا — کیا تم مجھ سے اب بھی محبت کرتی ہو؟ — کیا مجھے چھوڑ کر بمبئی چلی جاؤ گی؟ — کیا مجھے خودکشی کر لینی چاہیئے —؟

اسی طرح کے کچھ اور فقرے بھی تھے۔ گھنیشام نے لکھ کر سلیٹ ساوتری کے حوالے کر دی اور کہا — "اس کا انگریزی میں ترجمہ کرو۔"

ساوتری نے پہلا فقرہ پڑھا تو اس کے چہرے پر سیاہی سی پھیل گئی۔ دُوسرا، تیسرا اور چوتھا اور پھر اس نے تمام فقرے پڑھ لئے۔ وہ خاموش تھی۔

گھنیشام نے سنتوش کو پڑھانا شروع کر دیا۔ لیکن اس کی نظر تو ساوتری کی سلیٹ پہ تھی۔ ساوتری نے اس کی طرف دیکھا تو گھنیشام نے سنتوش کو پڑھانا شروع کیا اور پھر اس نے ساوتری کی طرف اچانک دیکھا تو ساوتری پھر خاموش تھی۔ ساوتری نے دیکھا تو گھنیشام پھر دُوسری طرف متوجہ ہو گیا۔

اچانک ساوتری نے سلیٹ رکھ دی اور یہ کہتی ہوئی چلنے لگی — "میری طبیعت خراب ہے۔ میں ترجمہ نہیں کر سکتی۔"

گھنیشام نے کہا — "ٹھہرو ذرا......"

"میرا سر چکرا رہا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

گھنیشام نے پھر کہا — "تمہیں کیا تکلیف ہے؟"

" میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔" یہ کہتی ہوئی وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

گھنیشام ہونّقا سا رہ گیا۔ وہ اُس کے پیچھے دوڑنا چاہتا تھا کہ اچانک اسے سلیٹ کا خیال آیا۔ اگر کوئی اُسے دیکھ لے تو.....

اس نے سلیٹ اُٹھالی۔ اُس نے دیکھا تو لکھے ہوئے تمام فقرے ساوتری نے مٹا ڈالے تھے اور اُن کی جگہ ایک ہی فقرہ لکھا تھا —— "ساوتری کہیں نہیں جائے گی ماسٹر جی۔"

گھنیشام کا دل گدگدا اُٹھا۔ جی چاہا کہ وہ اُس تحریر کو چوم لے۔ اُسے ایسا محسوس ہوا گویا ساوتری پریم کی مورتی بن کر اُس کی آنکھوں میں ناچ اٹھی ہو۔ ایک حسین سی میٹھی سی مسرت جاگ اٹھی۔ اُس نے اطمینان کی ایک سانس لی۔

سنتوش نے کہا —— "ماسٹر جی آپ کیا سوچ رہے ہیں ؟"

" نہیں تو۔" اُس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹا اور اُس نے کچھ سمجھے بغیر جواب دے دیا۔ اور پھر سنتوش کی پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اُس نے کہا —— "تمہاری جیجی کو کیا تکلیف ہے ؟"

" کچھ بھی نہیں۔" اُس نے بھولے پن سے کہا۔

" ابھی ابھی کیا بات کہہ رہی تھی تم سے ؟"

سنتوش خاموش رہی۔

گھنیشام نے پھر پوچھا —— "بتاتی کیوں نہیں ؟"

سنتوش نے کہا —— "مجھے ڈر لگتا ہے۔"

گھنیشام نے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا —— "کچھ نہیں کہوں گا تمہیں۔ سچ سچ بتا دے نا میری اچھی بہن۔"

سنتوش نے مسکرا کر کہا —— "جیجی کہتی تھیں ماسٹر جی بڑے جنونی ہیں۔ خواہ مخواہ ناراض ہو جاتے ہیں۔"

گھنشیام کو ہنسی آگئی۔ اُس نے پھر پوچھا ــــ "تو تم نے کیا کہا تھا؟"

"کچھ بھی نہیں۔ آپ مجھ سے ناراض نہیں ہوتے، اِس لئے میں کیوں شکایت کروں۔" اُس نے بچّے کی سی سادگی سے جواب دیا۔

گھنشیام نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

پڑھائی کے بعد وہ اپنے کمرے میں گیا۔ کوٹ اُتارا اور چائے کا انتظار کرتے ہوئے کتاب اُٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا تو اُس نے دیکھا اُس میں کاغذ کا ایک پُرزہ رکھا ہوا تھا۔ اُس نے بے تابی سے کھولا اور پڑھنے لگا۔ یہ ساوتری کی تحریر تھی۔ اُس نے لکھا تھا:۔

"ماسٹر جی!

آپ خواہ مخواہ ناراض ہو جاتے ہیں۔ میں نے آپ کا دِل دُکھانے کے لئے کوئی بات نہیں کی تھی۔ پھر بھی آپ کو غصّہ آگیا اور آپ نے مجھے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ اگر کل بات سوجھ نہ جاتی تو کتنی شرمندگی ہوتی۔ میری تو خیر نہیں تھی۔

میں بمبئی نہیں جاؤں گی۔ اگر آپ یہی چاہتے ہیں کہ میں سکول میں نہ پڑھوں تو یہی سہی، لیکن اگر پتا جی نے مجبور کر دیا تو نہ جانے کیا ہوگا۔

نہ جانے مجھے آپ سے کیوں ڈر لگتا ہے۔ آپ کے سامنے کچھ بول بھی نہیں سکتی اِس لئے یہ خط لکھ رہی ہوں۔

آپ کی

ساوتری

گھنشیام خوشی سے جھوم اُٹھا۔ اِدھر جب سے وہ آیا تھا کئی بار ساوتری کی ایک یا دُوسری بات پر اُسے جنون آیا تھا۔ لیکن وہ کبھی اِتنا بگڑا نہیں تھا۔ اُس نے سوچا کتنا ٹھنڈا دماغ ہے اِس لڑکی کا۔ اگر کوئی اور ہوتا تو شامت آجاتی۔

اور پھر اُس رات اُسے کئی سہانے خواب آئے۔ اُن خوابوں میں اُس کے دماغ کے سوئے ہوئے تخیّلات نہ جانے اُسے کتنی ہی سُنہری وادیوں میں لے گئے، اور اُس نے کتنے ہی بھینے بھینے، میٹھے میٹھے گیت سُنے۔ گویا اُس کے دِل میں مسرّت کے تار ناچ

اُٹھے ہوں۔

رائے بہادر نے اُس کے بعد کوئی خط لکھا یا نہیں بہرحال اُسے نہیں معلوم لیکن چند دن بعد ہی جب وہ بی۔ اے کی کتابیں خرید کر لا رہا تھا تو اُس نے سریش بابو کے ڈرائینگ روم میں ایک موٹی سی کرخت سی آواز اور اس کے ساتھ ہی ساوتری ایک اجنبی سی لڑکی کے ساتھ کمرے سے باہر نکلی اور گھنشیام کو دیکھ کر مسکراتی ہوئی مکان کے اندرونی حصّہ کی طرف چلی گئی۔

کمرے میں داخل ہو کر اُس نے جونہی "نمستے" کہی اور کرسی پر بیٹھنے لگا تو اُس نے سریش بابو کو نووارد سے کہتے سُنا "یہی ہیں ہماری ساوتری کے ماسٹر جی۔"

گھنشیام نے اُنہیں بھی ہاتھ جوڑ کر نمستے کی۔ لیکن اُنہوں نے اُسے غور سے دیکھ کر پھیکی سی ہنسی ہنسنے کے سوا کوئی اور جواب نہیں دیا تھا۔

سریش بابو نے کہا ــــ "یہ میرے بھائی ہیں رائے بہادر جوگیش چندر۔ ساوتری کو بمبئی لے جانے کے لئے آئے ہیں۔"

گھنشیام خاموش رہا۔ وہ اِس بارے میں اپنی رائے ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

رائے بہادر نے سگار کو منہ کے کونے میں مسکاتے ہوئے چشمہ لگا کر گھنشیام کی طرف دیکھا۔ گھنشیام کانپ اُٹھا۔ رائے بہادر نے کہا ــــ "تو تمہیں تمہارا باپ بالکل نہیں بُلاتا۔ عجیب آدمی ہے۔"

گھنشیام کو یہاں آکر سریش بابو کی ہمدردی اور ساوتری کی محبت کی وجہ سے ماں باپ کی بے رُخی بھی بھولنے لگی تھی۔ وہ اُنہیں کچھ اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ پھر بھی رائے بہادر جوگیش چندر کی زبان سے اپنے باپ کے متعلق یہ لفظ سُن کر اُسے غصّہ آگیا، تاہم اُس نے مصلحت سمجھ کر کوئی جواب نہیں دیا۔

رائے بہادر نے پھر اُسی انداز میں کہا ــــ "سریش بھائی بڑے مخلص اور ہمدرد ہیں۔ لیکن آخر کار تمہاری جگہ ماں باپ کا گھر ہی ہے۔ یہاں آکر تم کبھی وہاں گئے بھی کیا؟"

"اُن لوگوں کے پاس جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ پڑھا لکھا کر خود ہی اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے گا۔" سریش بابو نے گھنشیام کو موقع دیئے بغیر ہی جواب دے دیا۔ اور پھر اُنہوں نے کہا ــــ "بڑا ہونہار لڑکا ہے۔ ساوتری کو پڑھاتے پڑھاتے ایک سال میں ایف۔ اے پاس کر لیا ہے۔ اب بی۔ اے کی تیاریاں کر رہا ہے۔"

رائے بہادر نے چشمہ اُتارا اور پھر اُسے ناک پر چڑھاتے ہوئے پہلے سے انداز میں گھنشیام کو دیکھ کر کہنے لگے ــــ "اب ساوتری اور سنتوش تو بمبئی چلی جائیں گی۔ ماسٹرجی کیا کام کریں گے۔ کس طرح اپنا خرچ چلائیں گے؟"

گھنشیام کانپ اُٹھا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ رائے بہادر بمبئی سے کیا فیصلہ کر کے آئیں گے اور ساوتری کو اپنے ساتھ لے جانے کے بغیر نہیں ٹلیں گے۔

نوکر چائے لے کر آیا۔ رائے بہادر نے ٹرے دیکھی۔ شاید اُن کے نزدیک گھنشیام اس قابل نہیں تھا کہ اُسے بھی اُن کی میز پر چائے نوشی کا موقع ملے۔ شاید اسی لئے اُنہوں نے تین پیالیاں دیکھ کر طیش میں آکر کہا ــــ "تمہیں دو پیالیاں لانے کو کہا تھا۔ تیسری کیوں لائے ہو؟"

"بھولے نے کہا تھا۔" اُس نے غلامانہ لہجے میں جواب دیا۔

"اچھا تو میں بھول ہی گیا۔" رائے بہادر نے کہا ــــ "ماسٹرجی کے لئے بھی ہو گی اُس نے۔"

سریش بابو نے گھنشیام کو کہا ــــ "آؤ چائے پی لو۔"

گھنشیام خاموشی سے بیٹھا ہوا دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ رائے بہادر کے لفظوں سے وہ پریشان ہوا اُٹھا تھا۔ اُس نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا ــــ "مجھے ضروری کام ہے۔ جا رہا ہوں۔ معاف کیجئے گا۔"

سریش بابو نے کہا ــــ "ٹھہرو تو ــــ!"

لیکن گھنشیام رُکا نہیں۔ کمرے سے باہر نکل گیا۔ اپنے کمرے میں داخل ہو کر اُسے

محسوس ہوا گویا تمام کائنات گھوم رہی ہے اور اُس کے پاؤں اُکھڑے جا رہے ہیں اور وہ پاگل سا ہو رہا ہے۔ اُس کی آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا۔ کتابوں کو زمین پر پھینکتے ہوئے اُس نے کہا ـــ "لعنت ہے اِس زندگی پر"

کرسی پہ بیٹھا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو نکل آئے۔ دروازہ بند کر کے وہ بچوں کی طرح رونے لگ گیا۔

پانچواں باب

وہ رات گھنشیام نے کس طرح گزاری یہ اُس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ سریش بابو کے کمرے سے نکلنے کے بعد ساوتری سے ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ راتے بہادر کی لڑکی کستم سے خوش گپیوں میں مصروف ہوگی۔ گھنشیام نے جب دونوں کو کمرے سے نکل کر کھلکھلاتے ہوئے دیکھا تب ہی نہ جانے کیوں وہ جل اُٹھا۔ اور جب کمرے میں داخل ہونے پر اُسے راتے بہادر کی باتیں سُننا پڑیں تو اُس نے محسوس کر لیا کہ اب معاملہ بگڑ چکا ہے۔

دُوسرے دن جب گھنشیام معمول کے مطابق سکول جا رہا تھا تو اُس کا دِل چاہتا تھا کہ ساوتری اُس سے ملے تو وہ اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں لگا کر اُس کے پاؤں کو بھگو دے اور اپنا دِل چیر کر رکھ دے۔ لیکن ساوتری کی شکل تک دکھائی نہ دی۔

سکول میں اُس کا جی نہیں لگا اور اِس پر ایک نئی مصیبت یہ نازل ہوئی کہ راتے بہادر جگدیش چندر بچوں کا لاؤ لشکر لئے وہاں بھی آدھمکے۔

گھنشیام نے جل بھن کر کہا ــــ "نمستے"۔

وہ یہ دیکھ کر اور بھی جھنجھلا اُٹھا کہ راتے بہادر کے ساتھ کستم اور اُس کے چھوٹے بھائی تو تھے ہی ساتھ میں سنتوش بھی تھی۔ مگر ساوتری نہیں تھی۔

رائے بہادر نے نمستے کا جواب دیئے بغیر کہا — "تو یہ ہمارا سکول ہے۔ تم یہاں کتنے گھنٹے پڑھاتے ہو؟"

"یہی کوئی چار گھنٹے"۔ گھنیشام نے جواب دیا۔ "اور پھر یہاں کوئی زیادہ ضرورت بھی تو نہیں"۔

"ہوں"۔ رائے بہادر نے اتنا ہی کہا اور پھر بلیک بورڈ اور الماری کو دیکھنے لگے۔ گھنیشام کی میز پر ایک کتاب رکھی تھی۔ اُسے انہوں نے یوں ہی اٹھا لیا۔ دیکھنے کے لئے نہیں بلکہ اُن کا دھیان تو سکول کے بچوں کی طرف تھا یا گھنیشام کی طرف۔

"سریش بابو بہت فضول خرچ ہیں"۔ انہوں نے کتاب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "یوں ہی پیسہ برباد کر رہے ہیں۔ آخر کیا ضرورت ہے اِن لونڈوں کے لئے سکول کی۔ پڑھ لکھ کر اپنے کام سے بھی رہ جائیں گے"۔

اور پھر گھنیشام کی طرف دیکھ کر انہوں نے کہا — "تمہارا کیا خیال ہے ماسٹر جی؟"

گھنیشام چپ رہا۔ رائے بہادر نے بھی اصرار نہ کیا۔ وہ غور سے کتاب پر لکھے ہوئے کچھ لفظوں کو دیکھ رہے تھے۔

گھنیشام کا ماتھا ٹھنکا۔ اُس نے پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا — "یہ ساوتری کی کتاب ہے۔ یونہی غلطی سے یہاں لے آیا تھا"۔

رائے بہادر نے اِس پر یقین کیا یا نہیں یہ تو معلوم نہیں، لیکن گھنیشام نے اُن کے چہرے کو دیکھا تو کانپ اٹھا۔ اُس نے جو کچھ کہا تھا جھوٹ تھا۔ کتاب اُس کی اپنی ہی تھی۔ بات دراصل یہ تھی کہ جب ہمدردی نے محبت کی جگہ لے لی اور ساوتری اُس کے قریب آ گئی تو خاموش طبع ہونے کے باوجود اُس میں ایک جنون سا داخل ہو چکا تھا اور اُس جنون کے زیرِ اثر ساوتری نے گھنیشام کی کتابوں پر جگہ جگہ اپنا نام لکھ دیا تھا۔ رائے بہادر دیکھ کر بل کھا گئے اور گھنیشام نے جب یہ دیکھا تو کانپ

اُٹھا۔ رائے بہادر نے رئیسانہ انداز میں چھڑی گھمائی اور یہ کہتے ہوئے نکل گئے "آج شام کو ضرور ملنا۔ کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں"۔

گھنشیام کے بدن میں کاٹو تو لہو نہیں۔ وہ آج تک جو کچھ سوچتا رہا تھا۔ آج تک اپنے ذہن میں جو نقشے بناتے تھے۔ وہ سب اُلٹ رہے تھے۔ اُس کی اُمیدوں پر پانی پھر رہا تھا۔ اُسے کبھی خواب میں بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ رائے بہادر جوگیش چندر اِس طرح وار دہوں گے اور اُس کی زندگی کی ناؤ ڈولنے لگے گی۔

اُس نے کھڑکی سے دیکھا۔ رائے بہادر کے اردگرد بچے اچھلتے کودتے نظر آرہے تھے اور رائے بہادر اُس کی کتاب لئے گھر کی طرف جارہے تھے۔ اُس نے دیکھا۔ ایک زخمی گدھے پر کوّے لپک رہے تھے۔ وہ اُن سے جان بچا کر بھاگنا تھا مگر وہ اُس کے زخموں سے گوشت کی بوٹیاں اُکھاڑنے پر تلے تھے۔

گھنشیام نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اُس نے سوچا۔ زندگی بھی عجیب معمّہ ہے۔ دو دن پہلے اُس کی ذہنی کیفیت کیا تھی اور آج کیا ہے۔ ماں باپ کی محبت چھن جانے کے باوجود اُسے ساوتری کی بے پناہ ہمدردی اور محبت حاصل ہوئی تھی۔ لیکن آج قدرت اُس سے یہ بھی چھین رہی تھی۔

سکول کا کام ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ پھر بھی وہ نہ جانے کیوں کمرے سے باہر نکل آیا۔ اُس کے قدم خود بخود سڑک کی طرف اُٹھنے لگے اور وہ ایک ایسے انسان کی طرح جسے اپنی منزل کا علم بھی نہ ہو، قدم اُٹھائے بڑھنے لگا۔

ممکن ہے ہمیشہ سے یہی بات چلی آرہی ہو۔ لیکن گھنشیام نے آج ہی محسوس کیا تھا کہ جس شخص کی زندگی میں کوئی سہارا نہیں اُسے جینے کا حق نہیں۔ زندگی وہی ہے جو بے کیف نہ ہو۔ مدّت کے بعد اُسے ایک ہمدرد ملا تھا۔ لیکن آج وہ بھی اُسے اپنا رقیب نظر آرہا تھا۔ اُسے ایسا دکھائی دے رہا تھا۔ گویا وہ خاک میں پڑا ہوا تڑپ رہا ہو۔ اور ساوتری اُسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی ہو۔ رائے بہادر جوگیش چندر کہہ رہے ہوں کہ اِس کا یہی حشر ہونا چاہئے۔ اِسے تڑپ تڑپ کر مرجانا

ہی چاہیئے۔ اُس کے قدم بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ آج اُسے نہ تو تھکان محسوس ہو رہی تھی۔ نہ ہی بھوک اور پیاس۔ اُس کی منزل سریش بابو کا مکان نہیں تھی۔ اُن کا مکان تو بہت دُور رہ گیا تھا۔ کچھ لمحے پہلے اُس نے اُس کی طرف ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی اور پھر اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے گر پڑے تھے۔

جب وہ گاڑی میں سوار ہوا تو ساتھ والے مسافر کے سگریٹ کے دھوئیں سے اُس کا دم گھٹنے لگا اور وہ چونک پڑا تھا۔ اُس نے کہا ـــــ "بھئی ذرا سگریٹ تو بند کرو۔"

"کیوں گاڑی تمہارے باپ کی ملکیت ہے کیا؟" اُس نے حقارت آمیز ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا اور ایک ساتھ سگریٹ کا لمبا کش لگا کر پورے زور سے دھواں اُس کی طرف چھوڑ دیا۔

باپ کا لفظ سن کر گھنیشام کو غصّہ تو آیا، لیکن وہ خاموش رہا۔ اُس نے زیادہ اُلجھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ اُس نے سوچا۔ اُس نے ٹھیک ہی تو کہا ہے۔ گاڑی اُس کے باپ کی تو نہیں۔ اور پھر اُس کے باپ کی گاڑی ہوتی تو......

اُسے خواہ مخواہ ہنسی آگئی۔ کتنی معنی خیز تھی یہ ہنسی..... اُس کے باپ کی اپنی گاڑی بھی تو تھی مگر ایک دن اچانک اُس پر اُس کا حق ختم ہو گیا تھا۔

گھنیشام کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اُس نے سوچا۔ اب اگر وہ گھر جائے تو ؟ کون پوچھے گا۔ اُس کی سوتیلی ماں اُسے رہنے بھی دے گی یا نہیں۔

مسافروں میں سے ایک بوڑھا کسان تھا۔ اُس کی گود میں ایک چھوٹا سا لڑکا تھا۔ جو کبھی اُس کی داڑھی پکڑ لیتا اور کبھی رونے لگتا۔ بوڑھا اُسے محبّت سے پچکارتا اور کبھی اُسے مٹھائی اور کھلونے دینے کے وعدے کر کے اُسے بہلانے کی کوشش کرتا۔ ساتھ والے مسافروں سے وہ کہہ رہا تھا کیا کروں یتیم بچّہ ہے۔ ماں باپ ریل کے حادثے میں مر گئے۔ یہ بچ گیا۔ رشتہ دار یتیم خانے میں داخل کر رہے تھے کہ میں نے سوچا اِسے رکھ

لال۔ ایک تو دل لگ جائے گا۔ دوسرے اِس کی زندگی سدھر جائے گی۔" بوڑھے کسان نے یہ کہہ کر ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

ساتھ والے مسافر نے جو زور زور سے بیڑی کے کش لگا رہا تھا، کہا ــــ" یہ تو ایک بچّے کی خوش قسمتی ہے۔ ورنہ آجکل کے زمانے میں کون کسی کی پروا کرتا ہے۔"

بوڑھے نے کہا ــــ" اپنا فرض ادا کرنے والی بات ہے۔ ورنہ اِس زندگی میں ہم نے تو خوشی نہیں دیکھی۔ چار لڑکے تھے بھر پور جوانی میں مر گئے۔ ایک بہو تھی جو کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ اب ایک پوتی ہے اور ایک یہ بچّہ۔ اِن ہی سے دل بہلا لیتا ہوں۔"

اور گھنیشام نے سوچا ــ اگر اِس بچّے کی بوڑھے کسان کی پوتی سے محبت ہو جائے تو...... کیا بوڑھا اِسے گوارا کرے گا؟ کیا بچّے کو کسی وقت اُس کی طرح سے گھر چھوڑ کر بھاگنا تو نہیں پڑے گا؟

اور پھر اُس نے دیکھا۔ اُس کے ساتھ بیٹھی ہوئی ایک میلی کچیلی سی عورت اُس کی طرف سرک رہی تھی۔ اُس نے دیکھا اُس عورت نے سامنے بیٹھے ہوئے مسافر کی طرف غصّہ کی نگاہوں سے دیکھا تھا۔ شاید وہ مسافر اُس سے محبّت کی پینگیں بڑھانے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ گھبرا کر گھنیشام کی طرف سمٹ رہی تھی۔

گھنیشام مُسکرا اُٹھا۔ اُس کے چہرے پر عجیب و غریب مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ گویا اُس کا مطلب اُس عورت سے یہ کہنا ہو کہ اگر اُس کا ساتھی مسافر سمٹ کر اُس کے نزدیک ہو جائے تو بھی وہ کچھ حاصل نہیں کر سکے گا۔ منزلِ مقصود پر پہنچ کر دونوں کے راستے الگ ہو جائیں گے عورت تو شاید یہ واقعہ بھول بھی جائے گی مگر عین ممکن ہے کہ مسافر راتوں کو اُسے یاد کرکے پریشان ہوتا رہے میلی کچیلی سی عورت! اُس نے اُسے پھر دیکھا مگر وہ سمٹتی ہوئی اُس کی طرف سرک رہی تھی۔ اُس نے سوچا۔ ساوتری بھی ایک لڑکی ہے۔ لیکن کتنی صاف ستھری، کتنی حسین، کتنی شوخ۔ رائے بہادر جگدیش چندر سنا پہنچتے تو ــــ وہ دونوں ایک ہو چکے

تھے۔ لیکن یہ عورت اُس کی طرف کیوں سرک رہی ہے۔ اُس نے دوسرے مسافر کو بدمعاش مگر اسے کیوں شریف سمجھ رکھا ہے۔ اُس نے بھی تو کسی سے محبت کی تھی۔ بلکہ یوں کہئے کہ کسی کی سادگی سے فائدہ اٹھایا تھا اور یہ میلی کچیلی سی عورت.....

"انسان ہو کہ شیطان!" یکایک عورت نے چلّا کر مسافر سے کہا ــــ "تمہارے گھر میں ماں بہن نہیں کیا؟"

گھنشیام چونک پڑا اور اُس کے ساتھ ہی دوسرے مسافر بھی۔ وہ مسافر کھسیانا ہو کر معافی مانگ رہا تھا۔

گھنشیام نے اُسے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا ــــ "بدمعاش کہیں کے! میں کتنی دیر سے دیکھ رہا ہوں۔ بے چاری کو پریشان کر رہا ہے۔"

اُس نے ایک دو گھونسے رسید کئے۔ دوسرے مسافروں نے بھی لعن طعن کی اور اُسے سیٹ سے اُتار کر نیچے بٹھا دیا۔

اُس عورت نے گھنشیام کی طرف شکریہ کی نگاہوں سے دیکھا اور پھر خالی جگہ دیکھ کر الگ ہو کر بیٹھ گئی۔

سٹیشن پر اُتر کر جب اُس نے دیکھا کہ عورت بھی اُتر پڑی ہے تو اُس نے اُس سے پوچھا ــــ "آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

گھنشیام نے پھر کہا ــــ "کیا اِس شہر تمہارا کوئی رشتہ دار رہتا ہے؟"

"نہیں" عورت نے کہا۔

"تو پھر کہاں جانا چاہتی ہو؟"

"کہیں نہیں۔"

گھنشیام کے لئے یہ ایک اور معمہ تھا۔ پہلے تو اُس نے اپنا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا لیکن اُس کا دل نہ مانا۔ اُس نے پھر اُس سے کرید کرید کر باتیں پوچھنا شروع کیں۔

اُس نے روتے ہوئے بتایا کہ بچپن میں ہی ماں باپ نے اُس کی شادی کر دی تھی۔ خاوند نالائق اور آوارہ گرد تھا۔ کسی کو قتل کرنے کے جرم میں اُسے پھانسی کی سزا ہوگئی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کے گھر آئی تھی لیکن باپ کے مرجانے کے بعد ماں کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ اب اُس کے رشتہ داروں نے اُسے نکال دیا ہے۔ اور وہ پریشان ہے کہ وہ کیا کرے اور کہاں جائے ـــــ اُس نے بتایا تھا کہ وہ لکھنؤ میں ہی کسی کام کی تلاش کرے گی۔ کوئی محنت مزدوری مل جائے تو اُس سے اپنا پیٹ بھرے گی۔

گھنشیام پریشان سا ہوگیا۔ وہ خود بے بس تھا۔ اِس لئے اُس کی امداد کیا کرسکتا تھا۔ تاہم اُس نے سوچا۔ کیا ایک بے کس عورت کو اِس طرح اکیلی چھوڑ جانا مناسب ہے۔ میلی کچیلی ہونے کے باوجود وہ جوان تھی۔ اُس کے پھٹے ہوئے کپڑوں سے بھی اُس کا حسن تاریکی میں روشنی کی کرنوں کی طرح چھن رہا تھا۔ اگر وہ کسی کے ہاتھ چڑھ گئی تو.....

"ٹکٹ لاؤ" یہ ٹکٹ بابو کی آواز تھی۔

گھنشیام جیب سے ٹکٹ نکالنے لگا۔

وہ عورت روپڑی۔ "غریب ہوں حجور۔ میرے پاس ٹکٹ نہیں"۔

گھنشیام نے ٹکٹ نکال کر کہا ـــــ یہ ہے اِس کا ٹکٹ"۔

اور تمہارا؟"

گم ہوگیا" اُس نے جھوٹ سے کہہ دیا۔

تو جرمانہ ادا کرنا پڑے گا" ٹکٹ بابو نے اُسے دیکھ کر کہا ـــــ "تم جیسے کئی جنٹلمین اکثر یہی بہانہ کرتے ہیں" اور پھر اُس عورت کو گھورتے ہوئے دیکھ کر کہا "یہ کون ہے؟ ـــــ تمہاری بہن یا لڑکی تو نہیں ہوسکتی؟"

"نہیں"

"معلوم ہوتا ہے بھگا کر لائے ہو ـــــ نینی تال سے آئے ہو نہ؟"

"جی۔"

"وہاں سے اکثر لوگ اِس طرح لڑکیاں بھگا کر لاتے ہیں۔ دیکھنے میں تو شریف آدمی معلوم ہوتے ہو یہ پیشہ کب سے اختیار کر رکھا ہے؟"

عورت رو پڑی۔ گھنیشام تذبذب میں تھا۔ اُس نے کہا — "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں — میں اِسے بھگا کر نہیں لایا!"

ٹکٹ بابو کو کسی نے آواز دی تھی۔ کچھ اور لوگ بلا ٹکٹ سفر کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ ٹکٹ بابو نے اُن کی طرف جاتے ہوئے کہا — "خیر تم لوگ یہیں ٹھہرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔ دیکھنا بھاگ نہ جانا!"

اُس کے جاتے ہی اُس عورت نے روتے ہوئے کہا — "اب کیا ہوگا بابو جی!"

گھنیشام بھی پریشان تھا۔ اُس نے کہا — "تمہارا کیا نام ہے؟"

"پرمیسری بابو جی۔"

"ایک کام کر سکتی ہو؟"

"کیا؟"

"یہ لوگ تمہیں تنگ کریں گے۔" اُس نے کہا — "اگر میں یہ کہہ دوں کہ تم میری بیوی ہو تو ..."

پرمیسری کانپ اُٹھی۔ اُس نے کہا — "یہ کیسے ہو سکتا ہے بابو جی! یہ تو مہا پاپ ہے"

گھنیشام نے کہا — "ٹھیک ہے لیکن اگر پولیس نے تمہیں پکڑ لیا تو تم مصیبت میں پھنس جاؤگی۔"

پرمیسری کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اُس نے کہا — "لیکن بابو جی — یہ تو ..."

ٹکٹ کلکٹر ایک پولیس مین کو لئے ہوئے آرہا تھا۔ انہیں دیکھ کر پرمیسری اور گھنیشام دونوں کانپ اُٹھے۔ گھنیشام نے سوچا وہ جھوٹ نہ بولے — پرمیسری گرفتار ہوتی ہے تو ہو جائے — اُس کی بلا سے۔ وہ جھنجھٹ میں کیوں پڑے — لیکن دوسرے لمحے اُسے اُس کی مظلومیت کا خیال بھی آگیا۔ وہ ابھی تذبذب میں ہی تھا کہ پولیس مین

نے اُسے گردن سے دبوچ لیا اور کہا ــــ "چلو تھانے میں! تم اِس عورت کو بھگا کر یج کرنہیں جاسکتے!"

گھنیشام نے اُس کی گرفت سے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے کہا "کیا مذاق ہے شریف آدمی کو تنگ کرتے ہوئے ڈر نہیں آتا تمہیں؟"

"تم شریف ہو ــــ؟" اُس نے کھلکھلا کر کہا ــــ "تو اِس لونڈیا کو کہاں لئے جا رہے ہو؟"

یہ کہہ کر اُس نے زور سے گھنیشام کو تھپڑ مارا اور کہنے لگا ــــ "ابھی تمہاری شرافت کا پتہ لگ جاتا ہے"

پرمیسری چلّا اُٹھی ــــ "یہ تو بے گناہ ہیں۔ اِنہوں نے کوئی جرم نہیں کیا حوالدار صاحب!"

"حرام زادی کہیں کی" سپاہی نے بھوئیں تانتے ہوئے کہا ــــ "حوالات میں پہنچو گی تو سب معلوم ہو جائے گا"

اور جب تھانہ میں پہنچے تو تھانیدار نے گھنیشام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "کون ہوتا ہے حرام زادے!"

گھنیشام پینٹ میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا۔ سپاہی نے ایک تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا ــــ "تمیز سے کھڑا ہونا بھی آتا ہے کپتان صاحب کے آگے! جانتے ہو یہ کونسی جگہ ہے!"

"کیا نام ہے تمہارا؟" تھانیدار صاحب نے گرجتے ہوئے پوچھا۔

"گھنیشام ــــ"

"باپ کا کیا نام ہے ــــ؟"

"باپ کا.....؟" گھنیشام کانپ اُٹھا۔ اُس نے سوچا کیا بتاؤں۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ سپاہی نے ایک اور تھپڑ جڑ دیا۔ "بتاتا ہے کہ نہیں حرام زادے؟"

"کاشی ناتھ بیرسٹر" اُس کے منہ سے اچانک نکل گیا۔

"کہاں رہتے ہو؟"

"لکھنؤ میں۔" اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
"یہ عورت کون ہے؟"
"یہ عورت.....: اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔
اِس کے بعد اُس نے عورت کی طرف جونہی دیکھا سپاہی نے اُس کی گردن پر ایک مُکّہ رسید کرتے ہوئے کہا — "ماں لگتی ہے کیا؟ سیدھا جواب کیوں نہیں دیتا!"
"یہ میری....." اُس کی آواز رُک گئی۔ وہ پھر خاموش ہوگیا۔
"بیوی لگتی ہے کیا؟" داروغہ نے ایک تھپڑ رسید کرتے ہوئے پوچھا۔
"جی — بیوی —"
عورت چِلّا اُٹھی — "نہیں حضور میں اِس کی بیوی نہیں۔ یہ مجھے کہتے تھے مگر میں....."
"تم نے انکار کردیا — تو یہ بات ہے۔" داروغہ جی نے گرجتے ہوئے کہا۔ "بُردہ فروش معلوم ہوتا ہے۔"
"نہیں حضور — میں....." گھنیشام صفائی پیش کرنا چاہتا تھا لیکن اِس سے پیشتر کہ فقرہ مکمّل کرتا داروغہ جی نے کہا — "اِس کے خلاف رپورٹ درج کرکے اِسے حوالات میں بند کردو!"
پرمیشری کے پاؤں سے زمین نکل گئی۔ وہ بھی اِس ڈرامہ کا مطلب نہیں سمجھ سکی تھی۔
گھنیشام کو دو آدمی گھسیٹ کر لے گئے۔ حوالات کا دروازہ کھُلا اور بند ہوگیا۔
گھنیشام اغوا کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا۔

*

چھٹا باب

غلطی کی بھی ہو اور گھنشیام اپنے آپ کو کس قدر بے گناہ ہی کیوں نہ سمجھتا ہو لیکن ایک تو اُسے اعتراف تھا کہ اُس نے غلط جگہ ہمدردی کرنے کا گناہ کیا ہے۔ دوسرے اُس کی بدنصیبی کی وجہ اُس کی اپنی بدقسمتی بھی تھی۔ اولاد بُری ہو تو بھی ماں باپ اپنے بچے کو جیل میں جانے سے بچاتے ہیں لیکن گھنشیام کے پتا کو اطلاع ملی تو اُنہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ ایسے نالائق بیٹے کی مدد نہیں کر سکتے۔ اُنہوں نے مقدمہ کی سماعت کے دوران میں شہ ہی چھوڑ دیا۔ عدالت کو لکھ کر اطلاع دے دی کہ اُن کا لڑکا آوارہ اور بدمعاش ہے۔ اخباروں میں اعلان کر دیا کہ اُنہوں نے اپنے لڑکے کو فارغ خطی دے دی ہے۔ ٹکٹ کلکٹر کی شہادت واضح طور پر اُس کے خلاف تھی۔ پریسیری نے جو کچھ کہا وہ بھی درست ہی تھا۔ اور سریش بابو جنہیں پہلے اُس سے ہمدردی تھی۔ اُس کے اچانک غائب ہو جانے اور اُس کے بعد رائے بہادر جوگیش چندر کی شکایت سے بدظن ہو چکے تھے۔ جب اخفا کے مقدمہ میں اُنہیں بھی طلب کیا گیا تو وہ بہت سٹپٹائے۔ اُن کی عزت کا سوال تھا۔ مجبور ہو کر اُنہوں نے شہادت دی۔

عدالت نے گھنشیام کو ایک سال قید سخت کی سزا دی۔ اُس کے خلاف ایک معصوم عورت کو ورغلانے کا جرم ثابت ہو چکا تھا۔

کہنا مشکل ہے کہ ساوتری کے دل پر کیا اثر پڑا۔ گھنشیام کے اچانک غائب

ہو جانے پر وہ بہت پریشان ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بھی بہے تھے۔ اُس نے کئی دن پیٹ بھر کھانا بھی نہیں کھایا تھا لیکن جب اُسے بتایا گیا کہ گھنیشام نے ایک غریب لڑکی کو اغوا کر لیا ہے اور اب حوالات میں ہے تو ایک دفعہ تو وہ حیران رہ گئی تھی۔ اُسے اُمید نہ تھی کہ گھنیشام یہ حرکت بھی کر سکتا ہے۔ لیکن جب شہادت کا سمن آگیا اور سریشٹ بابو اُس کی تعمیل کرتے ہوئے لکھنؤ سے ہو کر آئے تو اُسے یقین ہو گیا کہ گھنیشام ایک بدمعاش لڑکا تھا۔ اُس نے ایک دفعہ تو پرماتما کا شکریہ ادا کیا کہ وہ اُس کے چنگل میں پھنسی نہیں۔ اور رائے بہادر جوگیش چندر —— وہ تو خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ اُنہوں نے سمن کی تعمیل کے فوراً بعد کتاب والا واقعہ سُنایا۔ اپنی طرف سے بھی مرچ مصالحہ لگایا اور کہنے لگے —— "میں نہیں کہتا تھا کہ یہ اُس کے ماں باپ کا قصور نہیں۔ لڑکا خود آوارہ ہو تو ماں باپ کیا کریں"۔

گھنیشام کو رونے کے سوا اور کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ اُس نے سوچا —— آخر میں نے کیا قصور کیا ہے۔ میں نے تو اپنی طرف سے پرمیشری کو بچانے کی کوشش کی تھی۔ میری ہمدردی اُلٹی میرے لئے وبالِ جان بن گئی۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں بیچارہ بھولا بھالا لڑکا ہی تو تھا۔ اُس کا دل رو اُٹھا جیل کی مصیبتوں کے تصور سے اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگی۔

تاہم جیل کی دُنیا بھی عجیب ہوتی ہے۔ ٹاٹ کے کپڑے پہن کر گھنیشام تو رونے میں لگ گیا تھا لیکن اُس نے دیکھا کہ کتنے ہی دوسرے لوگ ٹاٹ کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ اِس کے باوجود اُن کے چہروں پر کوئی ملال نہیں۔ وہ وارڈر کے ہاتھوں سے پٹتے ہیں۔ اُن کی بے عزتی ہوتی ہے۔ کھانے کو ادھ کچی روٹی اور مٹی ملا ہوا ساگ ملتا ہے۔ اِس کے باوجود وہ جھوم جھام کر گانے گاتے تھے۔

اُن میں ایک مولوی نما داڑھی والا شخص بھی تھا۔ اُس کا نام تھا عبدالجبار۔ تمام قیدی کیا وارڈر اور کیا جیلر تک اُس سے امتیازی طور پر بڑی عزت سے پیش آتے تھے اور اُسے مولوی صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ گھنیشام کو بتایا گیا تھا کہ

اُس کے خلاف قتل کا مقدمہ چل رہا ہے لیکن اُسے اُمید ہے کہ وہ رہا ہو جائے گا۔ جیل کے اندر بھی اُسے اچھے سے اچھا کھانا ملتا تھا۔ اُسے نہ تو سگریٹ حاصل کرنے میں مشکل پیش آتی تھی نہ ہی پھل۔

گھنشیام کو روتے دیکھ کر مولوی صاحب نے ایک دن کہا ــــ "کیوں بے لونڈے! بیرسٹر صاحب نے تمہیں کیوں مدد نہیں دی؟"

گھنشیام نے کوئی جواب نہ دیا۔

مولوی صاحب نے اُسے پھل دیتے ہوئے کہا ــــ "تمہارا باپ ہماری طرف سے پیش ہو رہا ہے مگر تمہاری مدد کیوں نہیں کرتا؟"

گھنشیام پھر رو پڑا۔ مولوی صاحب نے اُسے دلاسا دیا اور کہنے لگے ــــ "فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔ اماں! تم تو اغوا کے الزام میں سزایاب ہو کر روتے ہو مگر ہمیں بھی تو دیکھو۔ قتل کا الزام ہے۔ اِس کے باوجود کوئی فکر نہیں کوئی فاقہ نہیں۔"

گھنشیام کو سارے جیل میں مولوی صاحب ہی ایک ہمدرد نظر آتے تھے۔ مولوی صاحب پڑھے لکھے تھے۔ نفیس اُردو میں بات چیت کرنے کے علاوہ انگریزی بھی جانتے تھے۔ کہنے لگے ــــ "ایک دفعہ باہر چلا جاؤں پھر تجھے بھی یہاں رہنے نہیں دوں گا۔ کاشی ناتھ بیرسٹری کے نشّہ میں مست ہے۔ اگر تجھے مقابلہ میں کھڑا نہ کر دیا تو نام نہیں۔"

گھنشیام کو چکّی پیسنے کا کام دیا گیا تھا لیکن مولوی صاحب نے نہ جانے کیا جادو کھیلا کہ ایک دن کی مشقت کے بعد اُسے قیدیوں کی حاضری لگانے کا کام دے دیا گیا۔ گھنشیام تو ایک دن ہی چکّی پیس کر رو اٹھا تھا لیکن جب مولوی صاحب نے اُسے بتایا کہ اُنہوں نے سب معاملہ ٹھیک کر لیا ہے اور کل سے وہ دُوسرا کام کرے گا تو گھنشام نے اطمینان کا سانس لیا۔

مولوی صاحب نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ــــ "تجھے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ایسا انتظام کر دوں گا کہ جتنے دن رہے گا مزے سے گزرے گی۔"

اور یہی ہوا۔ دو تین دن کے بعد گھنشیام کے لئے گھر جیسا کھانا آنے لگا اور

افسروں کی ڈانٹ ڈپٹ بھی بند ہوگئی۔ مولوی صاحب کا احترام کرنے والے گھنشام سے بھی ہمدردی کرنے لگے۔ ماحول اور سلوک کی اِس تبدیلی کی وجہ مولوی صاحب کی شخصیت ہی تھی۔ اس لئے گھنیشام قدرتی طور پر مولوی صاحب کی طرف مائل ہوتا چلا گیا اور اُسے آہستہ آہستہ یہ معلوم کرنے میں مشکل پیش نہ آئی کہ مولوی صاحب ہر فن مولا ہیں۔ اُن کا کوئی باقاعدہ بزنس نہیں۔ پھر بھی لاکھوں میں کھیلتے ہیں۔ کیونکہ کلکتہ سے لے کر پشاور تک اُن کی کوکین بکتی ہے اور وہ اور اُنکے ساتھی ایسے ایسے کام کرتے ہیں جن کی کسی عام انسان سے توقع نہیں کی جاسکتی۔

ایک دن مولوی صاحب عدالت میں اپنے مقدمے کے لئے گئے تو واپس نہیں آئے تو واپس نہیں آئے۔ اُس شام جب بھی دُوسرے قیدی واپس آئے تو اُنسے معلوم ہوا کہ مولوی صاحب بری ہوگئے ہیں اور فاتحانہ انداز میں رہا ہوکر چلے گئے ہیں۔ مولوی صاحب نے اُسے پیغام بھیجا تھا کہ وہ اُسے رہا کرانے کے لئے بھی کوشش کریں گے۔

تاہم گھنیشام رہا نہیں ہوا۔ کوئی آٹھ مہینے مولوی صاحب کی بدولت اُس کو قید کی مصیبتوں سے نجات مل رہی تھی۔ لیکن مولوی صاحب کے بری ہو جانے کے بعد اُس کی تقدیر نے پھر پلٹا کھایا اور قیدیوں کی حاضری لگانے کا کام اُس سے چھین کر اُسے رسیاں بٹنے پر لگادیا گیا۔

گھنیشام پھر پریشان ہوگیا۔ اب اُسے نہ صرف سارا دن مشقت کرنی پڑتی تھی، بلکہ گندہ اور ذلیل کھانا کھانے کے لئے بھی مجبور ہونا پڑتا تھا اگر وہ اپنے کام میں ذرا بھی سستی کرتا تو نمبردار کے ہاتھوں پٹنا بھی پڑتا تھا۔

یہ نہیں کہ اُن دنوں اُسے محض قیدی کی زندگی کی وجہ سے ہی پریشان ہونا پڑتا تھا بلکہ اُسے رہ رہ کر ایک طرف گھر کی یاد آتی اور دوسری طرف ساوتری کی۔ وہ سوچتا! یہ اندھیر ہی تو ہے کہ اُسے اتنا بھی معلوم نہیں کہ جسے اُس نے زندگی کا رفیق بنانے کا سنہرا خواب لیا تھا۔ وہ اُس سے اتنا دور ہوگیا ہے کہ اُسے اس کے جذبات کا احساس بھی نہیں —— ایک وقت تھا کہ ساوتری اُسے ذرا سا مغموم دیکھ کے

۱۶۲۵۹

مسکراہٹ کی بجلیاں بکھیرنے لگ جاتی تھی لیکن آج یہ حالت ہے کہ وہ ذلیل ہو رہا ہے۔ ایک مجرم کی سی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اِس کے باوجود اُسے کوئی احساس نہیں کوئی ہمدردی نہیں!

ایک دِن اُس نے جذبات کے بہاؤ میں ساوتری کے پتاجی کے نام خط دیا تھا۔ اپنی بے گناہی کی تمام داستان لکھ دی تھی لیکن اُس خط کا کوئی جواب نہیں آیا کئی دنوں کے بعد خط واپس آگیا۔ ڈاک والے نے اُس پر لکھا تھا کہ سریش بابو نینی تال سے بمبئی چلے گئے ہیں اور بمبئی کا پتہ معلوم نہیں ہو سکا

گھنیشام روا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ یہ بھی سوچنے لگا کہ جس شخص نے اُس کے خلاف عدالت میں شہادت دی تھی اگر ڈاک والے کو اُس کا پتہ بھی معلوم ہو جاتا تو کیا اُس کے خط کا جواب آتا۔ کیا ساوتری کے دِل پر اِس کا کچھ اثر پڑتا اور اگر وہ اُسے بے گناہ سمجھ لے تو بھی کیا اُس کی زندگی کی ساتھی بننے کے لئے جراٗت کر سکے گی؟

گھنیشام بعض اوقات محسوس کرتا کہ وہ پاگل ہو رہا ہے لیکن وہ پریشان ہو یا پاگل وقت کے چکر کو اِس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وقت گھڑی کی سوئی کی طرح دنوں راتوں اور ہفتوں کے فاصلے طے کرتا ہوا گذر رہا تھا۔ اِس دوران میں مولوی صاحب کے کئی خط آئے۔ اُن خطوں میں تسلی تھی حوصلہ تھا اور رہا ہو کر امداد دینے کے وعدے تھے۔ جو آخری خط آیا اُس میں درج تھا کہ کاشی ناتھ چل بسے ہیں اور نرملا میکے چلی گئی ہے

گھنیشام باپ کی طرف سے کتنا بھی دُکھی کیوں نہ ہو لیکن یہ خبر پڑھ کر اُس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ تقدیر کا چکر اور قدرت کی سنگدلی ہی تو تھی کہ وہ آخری وقت اپنے باپ کی شکل بھی نہیں دیکھ سکا!

اور ایک دِن جب اُس کے ٹاٹ کے کپڑے اتروا کر اُسے ایک سال پہلے کے کپڑے پہنائے گئے اور اُسے جیلر کے کمرے میں بُلا کر بتایا گیا کہ اُس کی جیل کی میعاد ختم ہو گئی ہے اور وہ آزاد ہے تو جیل سے باہر نکل کر اُسے محسوس ہوا کہ جس شہر میں پل کر وہ جوان ہوا تھا۔ اس شہر کے کونے کونے سے اُسے واقفیت تھی وہ اُس کے لئے ایک بالکل اجنبی دیس ہے ؛

ساتواں باب

اُس روز جیل سے رہا ہونے کے بعد اُس نے لکھنؤ کے چکر تو ضرور کاٹے لیکن جتنی دیر وہاں رہا پریشان ہی رہا۔ وہ اپنے باپ کے مکان پر بھی گیا تھا لیکن اُس مکان میں اب کوئی ایسی شخصیت بھی نہ رہی تھی جو اُسے نفرت کرنے کے لئے بھی اپنا سمجھتی ایک اور وکیل نے اُسے اپنی رہائش گاہ بنالیا تھا۔ اُس نے بتایا تھا کہ کاشی ناتھ جی قدرتی موت نہیں مرے بلکہ اُنہیں کسی نے ہلاک کرکے موٹر میں ڈال دیا تھا۔ لاش ایک گھنٹہ میں ملی تھی۔ موت کیا تھی ایک معمہ تھا۔ سارا شہر حیران تھا۔ پولیس تفتیش کر رہی ہے مگر کچھ پتہ نہیں چلا۔ نرملا خاوند کے مرنے کے چند دن بعد سب سامان بیچ کر کہیں چلی گئی تھی اور اب اِس مکان کی فروخت کے لئے سودے ہو رہے ہیں۔

گھنشیام اپنے دوستوں سے بھی ملا لیکن اُن کی نگاہوں میں اُس کے لئے نفرت تھی۔ وہ سب یہی سمجھتے تھے کہ وہ خطرناک مجرم ہے۔ آخر جیل میں جانا اور وہ بھی ایک عورت کو ورغلانے کے الزام میں کوئی معمولی ساگناہ تو نہیں تھا۔

گھنشیام نے ایک ٹھنڈا سانس لیا۔ شام کے دھندلکے میں جب اُس نے مایوسی سے آسمان پر نگاہ اُٹھائی تو اُسے محسوس ہوا گویا دُنیا اُس کے لئے تاریک ہو چکی تھی۔ اِس تاریکی میں روشنی کی کرن تھی تو مولوی صاحب کا مسکن۔ اِس لئے اُس نے وہی کا رُخ اختیار کیا۔

گاڑی دہلی پہنچی تو اُس نے اپنے آپ کو ایک اجنبی شہر میں پایا۔ کتنے ہی لوگ اُسی گاڑی سے اُترے تھے اور کتنے ہی دوسرے مسافر سوار ہو رہے تھے۔ اُن کے چہروں پر مسرت تھی۔ کتنے ہی مسافروں کے دوست اور رشتہ دار اُن کا استقبال کرنے کے لئے آئے تھے۔ اُن کے چہروں پر مسکراہٹ تھی لیکن گھنیشام کے چہرے پر فقط مایوسی تھی اور اُسے سٹیشن سے باہر آکر زمین آسمان اپنے گرد گھومتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

مولوی صاحب نے اُسے دیکھتے ہی چھاتی سے لگا لیا اور کہنے لگے ــــ "اماں تار دے دیا ہوتا۔ کسی آدمی کو بھجوا دیتا۔ خواہ مخواہ اتنی تکلیف کی۔ خیر تم آگئے تو اچھا ہو گیا۔ خدا کرے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

گھنیشام نے دیکھا ــــ مولوی صاحب کا مکان نہایت عالیشان تھا اور کمرہ نہایت سجا سجایا تھا۔ نوکر چاکر سب موجود تھے۔ معلوم ہوتا تھا کسی رئیس کا گھر ہے۔

مولوی صاحب نے کہا ــــ "میرے کہنے پر چلو گے تو زندگی بن جائے گی۔ انسان خود سمجھدار ہو تو اُسے کوئی شخص ترقی کرنے سے نہیں روک سکتا۔"

گھنیشام نے سُنا تو چپ ہو رہا کیوں کہ اِس بات کے سوا کہ مولوی صاحب کو کین فروشی کرتے ہیں اور سماج میں اُن کا کافی دبدبہ ہے اور کچھ معلوم نہیں تھا۔ اِس لئے وہ وہ کچھ سمجھ نہ سکا کہ مولوی صاحب نے اُس کے لئے کیا طے کیا ہے۔

مولوی صاحب نے کہا ــــ "یہ تو تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا لیکن تم اُس وقت مانو گے جب تمہیں تمہارے باپ کی ساری جائیداد دلا دوں گا۔ آخر جو چیز تمہاری ہے وہ تمہیں ہی مل کر رہے گی۔"

گھنیشام کی زندگی میں اُس کی مرضی کے خلاف انقلاب ہوا۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ ایک ڈیڑھ سال پہلے تو شاید وہ مولوی صاحب کی کسی بھی تجویز کو گناہ سمجھ کر ٹھکرا دیتا لیکن ایک تو اُس کی تقدیر نے اور دُوسرے مولوی صاحب ہی کی ہمدردی نے جو آہستہ آہستہ اُس کے دِل و دماغ پر چھاتی ہو رہی تھی، اُسے اُس راستہ کے لئے تیار کر دیا تھا جس پر مولوی صاحب خود بھی چل رہے تھے۔

مولوی صاحب اُن بڑے آدمیوں میں سے ایک تھے جو بڑے آدمی رہ کر وہ سب کچھ کر لیتے ہیں جن کے لئے چھوٹے آدمیوں کو جیل کی ہوا کھانا پڑتی ہے۔ وہ ایک طرف بڑی بڑی دعوتیں دیتے تھے اور دوسری طرف دعوتوں میں مدعو کئے جاتے تھے اور پبلک کاموں میں چندے بھی دیتے تھے ـــــ لیکن دوسری طرف وہ کوکین فروشی اور بردہ فروشی کرتے تھے اور ڈاکوؤں کے سردار بھی تھے۔ اُن کے ساتھیوں اور مریدوں میں ہندو بھی تھے مسلمان بھی اور سکھ بھی۔ اُن میں ایک وکیل لالہ گلال داس تھے اور ایک اور صاحب لالہ رام پرشاد تھے جو ایک بڑے رئیس کے مختار تھے۔ اُن کی اپنی موٹریں تھیں دولت اُن کے گھر کی باندی تھی۔ سماج میں اُن کی عزت تھی لیکن کون جانتا تھا کہ اِن بڑی بڑی قابلِ عزت ہستیوں کی صورت میں خطرناک قسم کے گناہ گار کام کر رہے تھے۔

مولوی صاحب نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ گھنیشام کا نام بدل کر ہردیال رکھ دیا۔ کہنے لگے "تمہیں ایک مرتبہ سزا ہو چکی ہے اس لئے نام بدل دینا مناسب ہے کسی کو تمہاری اصلیت معلوم نہیں ہو سکے گی"۔

گھنیشام ہردیال بن گیا اور جب پہلی مرتبہ اُسے کوکین کا ایک بنڈل لے کر مردان جانے کے لئے کہا گیا تو ایک مرتبہ اُسے خوف ہوا۔ اُس کے ضمیر نے اُسے کوسا لیکن جب مولوی صاحب نے ایک لچھے دار لیکچر جھاڑا تو اُس نے ارادہ بدل لیا۔ اُس نے اُن کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ وہ وفاداری سے اُن کی خدمت کرے گا۔

مولوی صاحب نے کہا تھا ـــــ "دو سو روپے ملیں گے اِس سودے میں نام بتا دیتا ہوں۔ اِن میں تقسیم کر دینا۔ راستے میں شاید مشکل پیش آئے لیکن مردان میں راستہ بالکل صاف ہوگا۔

اور واقعی راستہ صاف تھا۔ مردان پہنچ کر اُسے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ اُسے مولوی صاحب کے بتائے ہوئے تمام ٹھکانے معلوم ہو گئے اور اُسے یہ معلوم کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی کہ مردان مولوی صاحب کے کاروبار کے لئے کن لوگوں کی وجہ سے ایک محفوظ مقام ہے۔ محمد افضل تھانیدار تھا اور رادھا کشن اُس کا دلال دونوں

کو کمیشن ملتی تھی۔ اِسی طرح کے دلال کئی دُوسرے شہروں اور قصبوں میں تھے۔ اِس لئے مولوی صاحب کا کاروبار بخوبی چل رہا تھا۔

شام کے وقت رادھا کشن نے کہا ——— "چلتے ہو کوئی مال دیکھنے؟"

چند مہینے پہلے اگر کوئی اُس سے "مال وال" کی بات کرتا تو وہ اُس کا مطلب سمجھ نہ سکتا اور اگر سمجھ لیتا تو شاید اُس کا ضمیر اُسے اجازت نہ دیتا لیکن آج اُس نے انکار نہیں کیا۔ معمولی سی ہچکچاہٹ کے بعد جو اُس کے دِل سے نکل کر زبان تک بھی نہیں جا سکی۔

اُس نے سگریٹ سُلگاتے ہوئے کہا ——— "چلو مگر مال اوّل درجے کا ہونا چاہیئے"

"اوّل نہیں سپیشل درجے کا" رادھا کشن نے اُس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا ——— دیکھو گے تو عش عش کر اُٹھو گے"

اور اُس رات کتنی تنگ سی گلیوں کے چکر کاٹنے کے بعد رادھا کشن اُسے جس مکان میں لے گیا اُس کا دروازہ کھلتے ہی ایک بُوڑھی سی عورت نے چراغ سے راستہ دکھاتے ہوئے کہا ——— "آؤ وہ اُوپر ہی ہیں"

"مولوی صاحب نے بھیجا ہے آپ کو؟" ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے تمباکو چباتے ہوئے پُوچھا۔ "وہ تو ہمارے دیرینہ گاہک اور پُرانے مہمان ہیں"

ہردیال اور رادھا کشن تکیے کے سہارے بیٹھ گئے۔ اُس عورت نے سنجیدگی سے کہا ——— "فرمایئے کیا خدمت کروں۔ وسکی منگواؤں؟"

رادھا کشن کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ ہاں کہنے والا تھا کہ ہردیال نے کہا ———

"شکریہ! مجھے تو چائے کی ایک پیالی کافی ہوگی"

"تو آپ شراب نوشی نہیں کرتے؟" عورت نے حیرانی سے کہا۔

"جی نہیں" ہردیال نے جواب دیا۔

"ابھی نئے ہیں" رادھا کشن نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ——— "وقت گذرنے پر خود ہی کھل جائیں گے" ——— اور پھر اُس نے مسکراتے ہوئے کہا ——— "اپنے لئے تو وِسکی خوراک سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ لائیے ———!"

چائے نوشی اور وسکی کے دَور چل رہے تھے۔ ایک نوجوان سی، حسین سی، اُداس سی لڑکی کمرے میں آئی۔ چائے کی خالی کی ہوئی پیالی اور شراب کی بوتل اُٹھا کر پھر کمرے سے نکل گئی۔

اُس عورت نے جس کا نام زرینہ معلوم ہوا، ہردیال سے کہا — "دیکھا کیا مال ہے! پشاور سے آیا ہے۔"

رادھا کشن نے تائید کرتے ہوئے کہا — "کیا خوب ہے۔ سونے چاندی میں تلنے کے قابل ہے۔"

"اجی کیا پوچھتے ہو جس کے پاس جائے گا اُس کی دکان چل نکلے گی۔" زرینہ نے تعریف کے پل باندھتے ہوئے کہا۔ "سونے کی کان ہے سونے کی!"

بات درست ہی تھی۔ نوراں واقعی بے حد حسین لڑکی تھی۔ یہی کوئی چودہ پندرہ سال کی عمر۔ اُس کے سینے کے اُبھار کو دیکھ کر ایک مرتبہ تو ہردیال کے دل میں بھی جذبات کا سمندر اُمڈ پڑا۔ ساوتری کی شکل اُس کی آنکھوں میں آ گئی۔

"ایک ہزار لگے گا۔" زرینہ نے کہا۔

سودا سات سو میں ہو گیا۔ زرینہ نے دام کھرے کئے۔ رادھا کشن نے سو سو دونوں طرف سے وصول کر لئے۔

ہردیال نے کہا — "مال تو اچھا ہے لیکن کوئی مصیبت تو نہیں آئے گی؟"

"اجی اِس کی کیا مجال ہے۔" زرینہ نے کھلکھلاتے ہوئے کہا — "نہ ماں ہے نہ باپ۔ دو لقمے نصیب ہوں گے تو اللہ کا نام لے گی۔"

زرینہ کی بات ٹھیک لگی۔ مردان سے اِنٹر کے ڈبے میں دونوں سوار ہوئے تو نوراں نے نہ تو شور مچایا نہ ہی اعتراض کیا۔ سیاہ برقعہ اوڑھے اُس نے خاموشی سے سوٹ کیس اٹھایا اور ڈبے میں داخل ہو گئی۔

گاڑی چلنے لگی تو ہردیال نے کہا — "برقعہ اُٹھا دو — اب کسی سے ڈرنے کی بات نہیں۔"

نوراں خاموش رہی تو ہر دیال نے کہا ــــ "میں جو کہتا ہوں برقعہ اٹھا دو۔"
نوراں نے برقعہ اٹھا دیا۔ اُس کا چاند سا مکھڑا دیکھ کر ہر دیال کو مستی سی آگئی۔ اُس نے کہا "کب سے آئی ہو یہاں؟"
"کوئی ایک مہینہ سے" اُس نے آہستہ سے جواب دیا۔
ہر دیال نے دیکھا ــــ اُس کی آنکھوں میں حیا تھی اور چہرے پر معصومیت اور پژمردگی۔
اُس نے پھر پوچھا ــــ "کہاں سے آئی ہو؟"
"شب قدر سے" نوراں نے مختصر سا جواب دیا۔
"تمہارے ماں باپ کب مرے؟"
وہ خاموش رہی کوئی جواب نہیں دیا۔ ہر دیال نے غور سے دیکھا تو اُس کی آنکھوں سے .... آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے اُس کے مرمریں ہاتھ پر گر پڑے تھے۔
"تم رو رہی ہو!" اُس نے کہا۔
اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اُس نے اپنا منہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔
ہر دیال نے محسوس کیا کہ اُس کا دل بے ایمان ہو رہا ہے۔ نوراں بے بسی اور معصومیت کی مورتی تھی مگر ہر دیال کو اُس کے رونے میں بھی ایک لذت سی محسوس ہوئی۔
اُس نے کہا ــــ "اِدھر آؤ"
وہ اُٹھی نہیں ــــ
ہر دیال خود ہی اُس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ نہ جانے اُسے کیوں ہچکچاہٹ سی ہوئی لیکن ایک لمحہ بعد اُس نے اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور اُس کا منہ اوپر اُٹھاتے ہوئے اُس کے آنسو پونچھ ڈالے۔
نوراں کچھ پرے ہو کر بیٹھ گئی۔
ہر دیال نے کہا ــــ "تم رو کیوں رہی ہو؟"
"اس کے سوا اور کر ہی کیا سکتی ہوں بابوجی!" نوراں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے

کہا ــــ "سوچتی ہوں اب نہ جانے مجھ سے کیا سلوک ہوگا"
"تم بہت دکھی ہو گیا؟" ہردیال نے وہیں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
"آپ کا کیا خیال ہے"۔ نوراں نے انکساری کے لہجے میں جس میں طنز بھی تھا، پوچھا۔
ہردیال خاموش ہو گیا۔ نہ جانے نوراں کے اِن لفظوں سے اُس کے دِل میں جذبات کی اُمڈتی ہوئی لہریں کیوں ٹھنڈی پڑ گئیں۔
اُس نے دیکھا نوراں کا چہرہ پہلے سے زیادہ دُھلا ہوا اور پاکیزہ دکھائی دیتا تھا۔ اور وہ سنجیدگی سے باتیں کرنے کے لئے تیار تھی۔ آنسوؤں کی بارش سے اُس کے جی کا بوجھ کچھ نہ کچھ ہلکا سا ہو گیا تھا۔
گاڑی ایک دو سٹیشنوں پر رُکی اور پھر چلنے لگی۔ بھیڑ نہیں تھی نہ ہی اُن کے ڈبے میں کوئی تیسرا مسافر داخل ہوا تھا۔
یکایک ہردیال نے نوراں کے بازو پر مہندی میں کچھ لکھا ہوا دیکھا۔ وہ چونک پڑا۔ اُس نے بڑھ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ کہنے لگا ــــ "تمہارا اصلی نام کیا ہے؟"
نوراں کا رنگ فق ہو گیا۔ اُس نے کانپتے ہوئے کہا ــــ "نوراں ــــ"
ہردیال نے اُس کے بازو پر رام پیاری کا لفظ لکھا ہوا دیکھ کر کہا ــــ "یہ غلط ہے تم جھوٹ بول رہی ہو۔ تمہارا نام رام پیاری ہے۔"
نوراں نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ اُس نے دھیرے سے کہا ــــ "یہ غلط ہے میرا نام نوراں ہی ہے"۔
"تو پھر تمہارے بازو پر رام پیاری کیوں لکھا ہے؟"
نوراں رو پڑی۔ اُس نے آہستہ آہستہ اپنی رام کہانی بتانا شروع کر دی۔ اُس نے بتایا کہ اُس کا اصلی نام نوراں ہی ہے۔ اُس کے ماں باپ زندہ ہیں۔ زرینہ نے غلط کہا تھا کہ وہ مر چکے ہیں۔ اُس کا باپ ایک بڑے خان کا مزارعہ ہے۔ خان کے بیٹے نے اُسے سبز باغ دکھا کر اپنی محبت کے جال میں پھنسا لیا تھا اور وہی اُسے زرینہ کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ کئی دن تک وہ اُس سے عیش و عشرت کرتا رہا۔ اس کے بعد کسی جھگڑے

میں گرفتار ہو گیا۔ اِس لیے زرینہ نے گرفتاری کے خوف سے پہلے تو اُس کے بازو پر ہندوانہ نام کھدوا اور اُسے رادھا کشن کے پاس رکھا اور اب فروخت کر دیا ہے۔ ۔ ۔

ہردیال کے دِل میں کئی خیالات پیدا ہوئے۔ پہلے محبّت تھی اور ہمدردی۔ پھر اُس نے سوچا یہ محبّت نہیں بلکہ جنسی بھوک تھی۔ دُوسری طرف ہمدردی ہونے پر بھی اُس کے دل میں بے رُخی کا جذبہ پیدا ہونے لگا۔ اُس نے سوچا ایک دفعہ پہلے بھی تو اُس نے ایک عورت سے ہمدردی کی تھی لیکن اُس کی ہمدردی کی وجہ سے اُسے جیل جانا پڑا تھا۔ اب وہ کسی عورت سے ہمدردی نہیں کرے گا۔

گاڑی راولپنڈی کے سٹیشن پر رُکی تو ایک اور مسافر اُس ڈبّے میں سوار ہو گیا تھا ہردیال کے اشارے پر نوراں نے برقعہ اوڑھ لیا۔ دہلی تک اُن میں کوئی خاص بات چیت نہیں ہوئی۔ گاڑی دہلی پہنچی تو وہ نوراں کو لے کر سیدھا مولوی صاحب کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔

مولوی صاحب نے نوراں کو دیکھا تو جھُوم اُٹھے۔ کہنے لگے "تم نے تو کمال کر دیا لونڈے! اُستاد کو بھی مات کر دیا۔"

ہردیال کو دوسو کی بجائے تین سو روپے مِل گئے۔

آٹھواں باب

مولوی صاحب کا کاروبار وسیع تھا۔ یہ جاننے میں ہرد یال کو چنداں مشکل پیش نہیں آئی۔ وہ ایک کام کے لئے ڈھاکہ گیا تھا۔ اُسے معلوم ہوا کہ وہاں مولوی صاحب کی تین ٹکڑیاں چلتی ہیں۔ روزانہ ہزاروں کے داؤ چلتے ہیں اور اُن میں بڑے بڑے "شریف بزرگ" حصّہ لیتے ہیں۔ جن لوگوں سے عام مجرم ڈرتے ہیں اُن کی جیبیں گرم کر دی جاتی ہیں اِسلئے مولوی صاحب اور اُن کے شاگرد محفوظ رہتے ہیں۔ کسی کی مجال نہیں کہ اُنگلی اُٹھا سکے۔

ہرد یال کو اِس کاروبار کے بہت سے راز معلوم ہو چکے تھے۔ اگر وہ مولوی صاحب سے الگ ہو کر نجی طور پر کاروبار شروع کرے تو کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ لیکن ایک تو وہ جھجکتا تھا۔ دُوسرے اُسے اندیشہ تھا کہ مولوی صاحب اِس کاروبار میں کوئی حریف برداشت نہیں کریں گے اور تیسری بات یہ تھی کہ اُسے رہ رہ کر ایک طرف اپنی سوتیلی ماں اور دوسری طرف سادتری کا خیال آتا تھا۔ سوتیلی ماں سے اُسے محبت یا ہمدردی نہیں تھی بلکہ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح اسے نیچا دکھائے اور سادتری سے اُسے اب بھی گہری محبت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک دفعہ ملاقات ہو تو وہ اُس کے قدموں پر سر رکھ دے اور آنسوؤں سے اُس کے پاؤں بھگو دے۔ شاید اِس طرح اُس کا دل پگھل جائے اور وہ دونوں ایک ہو سکیں۔ لیکن یہ سب باتیں کیونکر ہوں۔ اس کے لئے کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔

ہر دیال مولوی صاحب کے ایک کام پر لاہور گیا تھا۔ لاہور میں کینال پارک کے نزدیک ایک کوٹھی میں مولوی صاحب کے ایک شاگرد کی گدی چلتی تھی۔ ہر دیال نے ایک تو گزشتہ تین مہینوں کا حساب لینا تھا اور دوسرے "نئے مال" کی تلاش کرنا تھا۔ لاہور سے پیغام آیا تھا کہ کشمیر کے راستے نوجوان لڑکیاں نہایت سستی قیمت پر آ سکتی ہیں اور پھر اُن سے وارے نیارے ہو سکتے ہیں۔ مولوی صاحب نے ہر دیال کے ذمہ یہ کام لگایا تھا کہ وہ لاہور جا کر تمام اصلیت معلوم کرے اور اگر مناسب ہو تو خریدنے کا انتظام کرے

لاہور میں مولوی صاحب کے خلیفہ تھے ایک اور مولوی صاحب۔ دستور علی۔ اُن کے ساتھ ہی ایک اور صاحب بھی تھے جنہیں دوسرے لوگ "دیوان صاحب" کہتے تھے۔ ہر دیال دیوان صاحب کے مکان پر ٹھہرنے کی بجائے میکلوڈ روڈ کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔

ہوٹل کے جس کمرے میں وہ ٹھہرا تھا اُس کے ساتھ ہی یو۔ پی کے ایک صاحب جو کوئی بڑے رئیس معلوم ہوتے تھے، ٹھہرے ہوئے تھے۔ اُن کے ساتھ دو فیشن ایبل عورتیں بھی تھیں۔ ہر دیال نے انہیں ٹھیک طرح سے دیکھا نہیں تھا۔ کیونکہ جس وقت وہ اُس کے کمرے سے ہو کر گزری تھیں شام کا دھندلکا تھا اور اُس میں اُن کی شکل نظر نہیں آئی تھی۔ لیکن ہر دیال نے اُن کے فیشن اور اُن کے جسم سے آنے والی خوشبو سے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ حسین اور کسی اُونچے گھرانے کی عورتیں ہیں۔

رات کو ہر دیال سینما دیکھ کر واپس آیا تو دیوان صاحب بھی ساتھ ہی تھے۔ دُوسرے کمرے سے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ دیوان صاحب نے کہا۔ لاہور میں آئے ہو تو تمہیں کچھ رنگ رُوپ بھی دیکھ لینا چاہیئے۔

"آپ کا مطلب؟" ہر دیال نے حیرانی سے پُوچھا۔

"یہی کہ تم نے جگہ جگہ کا پانی تو ضرور پیا ہو گا مگر لاہور کے حُسن کا نظارہ نہیں کیا ہو گا۔" دیوان صاحب نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"میں ان باتوں سے دُور ہی رہتا ہوں دیوان صاحب!" ہر دیال نے سنجیدگی سے کہا۔

"بہت خوب" دیوان صاحب نے ہردیال کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ "تمہیں دوسروں کو بنانا تو خوب آتا ہے"۔

"درحقیقت میں جو کچھ کہہ رہا ہوں درست کہہ رہا ہوں۔ میں آج تک کسی عورت کے پاس نہیں گیا"۔

"گویا پانی میں رہ کر مگرمچھ سے بیر رکھتے ہو" دیوان صاحب نے پھر زور سے قہقہہ لگایا۔۔ "بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لینے میں کیا ہرج ہے بابا!"

دیوان صاحب کے بہت اصرار کرنے کے باوجود ہردیال نہ مانا تو دیوان صاحب نے کہا۔۔۔ "اچھا ایک اور بات ہے۔ مانو گے کیا؟"

"فرمائیے"۔

دیوان صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔۔۔ "تمہارے بغل والے کمرے میں شاندار مال آیا ہوا ہے۔ طبیعت سے کہ اُسے کسی طرح قابو کیا جائے"۔

اگرچہ ہردیال مولوی عبدالجبار کے چکر میں بُری طرح پھنسا ہوا تھا لیکن ابھی تک اُس نے ان چنچل شریف زادیوں کو پریشان کرنے کا کبھی فعل نہیں کیا تھا۔ اُس نے کہا۔ "کیوں اُن کے بغیر آپ کو چین نہیں آتا کیا؟"

"چین کا سوال نہیں ہردیال بابو"۔ دیوان صاحب نے کہا۔ "بات یہ ہے کہ یہ دُنیا ہی اُن لوگوں کے لئے ہے جو مزے سے زندگی بسر کرنا ایمان سمجھ لیں۔ ہر بات میں پرہیز۔ ہر بات پر نفرت۔ یہ ہم لوگوں کی عادت نہیں"۔

ہردیال نے اِس کے بعد کوئی اعتراض نہیں کیا۔ "اچھا بابا! تمہاری مرضی لیکن میں اِس سودے بازی میں حصّہ نہیں لوں گا"۔

"آپ بے شک الگ رہیں لیکن۔۔۔۔"

"مجھے مداخلت کا کوئی حق نہیں ۔۔۔۔" ہردیال نے فقرہ پورا کرتے ہوئے کہا۔۔۔ "یہی آپ کی خواہش ہے نا"۔

اتفاق ہو گیا۔ دیوان صاحب وہیں ٹھہر گئے اور ہردیال کھانا کھانے کے بعد سو گیا۔

دوسری صبح جب وہ بیدار ہوا تو دیوان صاحب نے کہا ــــ "اب میں جاتا ہوں لیکن مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ چڑیا ہاتھ سے نکل نہیں سکے گی۔"

ہرڈیال دن بھر کینال پارک والے اڈے پر رہا۔ شام کو وہاں سے پھر سینما چلا گیا۔ واپس آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُس کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا اور دیوان صاحب کے کسی عورت سے بات چیت کرنے کی آواز آ رہی تھی۔

ہرڈیال محض یہ کہہ کر کہ میں ایک گھنٹہ بعد چلا جاؤں گا باہر نکل گیا۔ جاتے وقت وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کونسا جادو ہے جس کے ذریعے دیوان صاحب نے اِس چھوکری کو پھانس لیا ہے۔

وہ ہوٹل کے نیچے ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے لگ گیا کہ اتنے میں دیوان صاحب جھومتے جھامتے آ بیٹھے۔

ہرڈیال نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بھئی یہ سب تمہاری مہربانی ہے۔ تمہاری امداد سے ہی سب کچھ ہوا۔"

اِس کے بعد دیوان صاحب نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا ــــ "مال تو شاندار ہے۔"

"کیسے؟"

دیوان صاحب نے کہا ــــ "ان کا ساتھی تو دوسری لڑکی کے ساتھ رفوچکر ہو گیا ہے اور اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔ یہ اکیلی رہ گئی ہیں اور اپنے قابو میں ہیں۔"

ہرڈیال چونک پڑا۔ اُس نے کہا "کیا معاملہ یہ ہے۔ مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔"

دیوان صاحب نے کہنا شروع کیا ــــ "اِس عورت کا نام نرملا ہے۔ اِس کا خاوند کوئی بڑا مالدار آدمی ہے مگر یہ عورت اُسے فریب دے کر اس اجنبی شخص کے ساتھ بھاگ کر یہاں آئی تھی۔ اس کے ساتھ جو دوسری لڑکی تھی وہ بھی کسی بڑے گھرانے سے تعلق رکھتی

یہ باتیں مجھے کل رات ہی بند کمرے میں اُن کی گفتگو سے معلوم ہو گئی تھیں۔ آج اس شخص کو گرفتار کرا دینے کی دھمکی دی تو وہ دوسری لڑکی کو لے کر غایب ہو گیا اور اب

رشوت کے طور پر ہمارے حوالے کر گیا۔ اب اُس کا مستقبل ہمارے ہاتھوں میں ہے۔"

ہردیال کو کھانے پینے کی سدھ بدھ بھول گئی۔ اُس نے کہا — "تو آج کا دن تو مزے سے گزرا ہوگا۔"

دیوان صاحب مسکرا دیئے اور اس کے بعد اُنہوں نے کہا — "آج تم اُس سے نہ ملو۔ اُس کے آشنا کے کمرے میں ہی اُس کے پاس رہوں گا اور رات بھر ساری باتوں کا پتہ کر کے تمہیں بتا دوں گا۔"

ہردیال کے دل میں بس باتیں معلوم کرنے کا شوق تھا۔ وہ اُسے دیکھنے کا خواہشمند تھا۔ تاہم اُس نے کہا — "مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن احتیاط کرنا کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو —" دیوان صاحب نے کہا۔ "اب میں جاتا ہوں اُسے لے کر دوسرے کمرے میں۔"

ہردیال دوپہر پہنچا تو دیوان صاحب نرملا کو لے کر دوسرے کمرے میں جا چکے تھے۔ اُن کا کھانا بھی اسی کمرے میں آیا تھا اور ہردیال کو بیرے سے معلوم ہو گیا تھا کہ دونوں ایک ساتھ ہی کھا رہے ہیں۔ اُس نے یہ بھی بتایا تھا کہ میم بہت خوبصورت ہے۔

ہردیال کو رات بھر نیند نہ آئی۔ یہ عورت کون ہے، اس کا خاوند کون ہے، اس نے اپنے خاوند کو کیوں چھوڑا — یہاں کیسے آئی اور اب اس کا کیا بنے گا؟ اس طرح کے کتنے ہی سوال اُس کے دماغ میں آئے۔ کوئی معقول جواب نہ ہونے کی وجہ سے اُسے نیند نہ آئی۔ دیوان صاحب بات میں مصروف تھے لیکن کیا باتیں ہو رہی تھیں اُسے یہ معلوم نہ ہو سکا۔ اُسے صرف معلوم ہوا کہ وسکی منگوائی گئی ہے اور اُس کے جام چڑھائے گئے ہیں۔

کوئی آدھی رات کے بعد جب اُونگھنے کے بعد اُس کی آنکھ کھلی تو اُس نے دیکھا کہ تاریک میں بجلی فیل ہو گئی ہے — بے چینی کی وجہ سے وہ بستر سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

شاید دیوان صاحب کے دماغ میں کوئی شرارت سوجھی یا محض ہردیال کی بے چینی

کی وجہ سے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوا۔ وہ دروازہ کھول کر اُس کے کمرے میں آ گئے۔ کہنے لگے ۔۔۔ "چلو تمہیں بھی لے چلوں"۔

"کہاں؟"

"ساتھ والے کمرے میں"۔

"مگر میں تو....."

"یہ میں جانتا ہوں کہ تم اِن باتوں کے حق میں نہیں مگر اندر جانے میں کیا ہرج ہے؟" دیوان صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اُن کے منہ سے شراب کی بدبو آ رہی تھی۔

ہردیال ہچکچایا تو دیوان صاحب نے کہا ۔۔۔ "صبح کسی کو معلوم نہیں ہوگا۔ وہ شراب کے نشے میں مدہوش ہے۔ تم محض کمرے میں آ جاؤ۔ صبح ہوتے ہی بلے بغیر چلے جانا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی"۔

ہردیال رضامند نہیں تھا کیونکہ اُسے اندیشہ تھا کہ وہ کسی مصیبت میں پھنس جائیگا لیکن اُسے کھینچ کر دیوان صاحب دوسرے کمرے میں لے گئے۔

کمرے میں تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ شراب کی بدبو چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ دیوان صاحب کا ہاتھ پکڑے ہوئے وہ کمرے میں چل رہا تھا۔ اُنہوں نے جہاں بٹھایا وہ وہیں بیٹھ گیا۔

دیوان صاحب نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر نرملا کے جسم سے لگاتے ہوئے کہا ۔۔۔ "محسوس کر سکتے ہو تو کرو کتنا گداز ہے"۔

ہردیال کے جسم میں بجلی کی سی رو پھیل گئی۔ تاہم اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "اِس بدبو میں مجھے بالکل نیند نہ آئے گی۔ میں اپنے کمرے میں جاتا ہوں"۔

"گھبرا گئے ہو کیا؟" دیوان صاحب نے کہا ۔

"کچھ ہی سمجھ لیجئے مگر میں اس کمرے میں ایک لمحہ کے لئے بھی بیٹھ نہیں سکتا"۔

دیوان صاحب نے بہت روکا مگر ہردیال نہ رُکا اور اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔
شراب میں بدمست عورت اُس کے لئے کوئی معمہ نہیں تھی۔ کیونکہ اُس نے اِس طرح کے کئی واقعات دیکھے تھے۔ لیکن اُسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ رات بھر کروٹیں بدلتے ہی گذری صبح نیند آئی تو کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔

ہردیال کو محسوس ہوا کوئی بھیانک خواب آ رہا ہے۔ وہ چونک پڑا۔ اُس نے دروازہ کھولا تو ساتھ والے کمرے کی عورت اُس کے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

ہردیال کی آنکھوں میں نیند کی خماری تھی۔ آنکھیں مَلتے ہوئے اُس نے کہا۔ "آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"دیوان صاحب کہاں ہیں؟" اُس عورت نے کمرے میں داخل ہو کر کُرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر وحشت سی چھا رہی تھی۔

ہردیال کو ایسے محسوس ہوا گویا اُس نے اُس عورت کو کہیں پہلے دیکھا ہوا ہے اور اُس کی آواز کہیں پہلے سُنی ہوئی ہے۔

اُس نے کہا۔ "یہ آپ کو ہی معلوم ہو گا۔ رات کو تو وہ آپ کے کمرے میں ہی تھے۔"
عورت کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اُس نے کہا۔ "وہ میرے تمام زیورات لے کر غائب ہو گئے ہیں۔ اب میں کہیں کی نہیں رہی۔"

ہردیال چونک پڑا۔ اب تک اُس نے عورت کو غور سے نہیں دیکھا تھا۔ اُس کی آواز سُنی تو اُس نے چونک کر دیکھا۔ عورت نے بھی اُسے دیکھا تو اُس کے پاؤں لڑکھڑا گئے۔ اُس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ "گھنیشام!"

"ماں۔۔۔!" ہردیال کے منہ سے بھی چیخ نکل گئی۔ نرملا اُس کی سوتیلی ماں ہی تو تھی۔ ہردیال کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ نرملا بھی اپنے آپ پر قابو نہ پا سکی۔ اُس کے پاؤں لڑکھڑائے اور وہ زمین پر گر پڑی۔

ہردیال اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اُس نے فرش پر پڑی ہوئی بے ہوش ماں کو دیکھا۔ وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ سوچنے لگا۔۔۔ اب کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ پہلے تو نفرت اور

شرمندگی کے مارے اُسے خیال آیا کہ سوتیلی ماں کا گلا گھونٹ کر غائب ہو جائے۔ دوسرے اُس کے دل میں انسانیت اور بدنامی کا جذبہ پیدا ہوا۔ اُس نے دوڑ کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ نرملا بے ہوش پڑی تھی۔ ہردیال نے پانی لے کر اُس کے منہ پر چھڑکا۔ منہ کھول کر پانی ڈالا۔ نرملا کو ہوش آنے لگا۔ اُس نے آنکھیں کھولیں اور شرم کے مارے بند کرتے ہوئے کہا ــــ "مجھے مر جانے دو گھنشیام! میں تمہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی ہوں ــــ میرا ــــ"

گھنشیام ابھی تک تذبذب میں ہی تھا۔ اب اُس نے سوچا کہ یہاں ٹھہرنا کس قدر خطرناک ہے۔ اُس نے نفرت ہونے کے باوجود سنبھل کر کہا ــــ "جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ اب باتیں کرنے کا وقت نہیں رہا۔ ہوش میں آؤ اور یہاں سے چلی چلو۔"

نرملا شرمندگی کے مارے کچھ کہہ نہ سکی۔ ہردیال نے کہا ــــ "وقت کی مصلحت سمجھو ورنہ دیر ہو گئی اور ان لوگوں کو معلوم ہو گیا تو تم کہیں کے نہیں رہیں گے۔"

نرملا کو ہردیال نے خود ہی اٹھایا۔ دوسرے کمرے سے کپڑے لا کر لباس تبدیل کرایا نیچے جا کر تمام بل ادا کیا اور سامان اٹھوا کر باہر نکل گیا۔ نرملا پروگرام کے مطابق باہر آئی اور چوک پر اُس کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔

گاڑی چلی تو نرملا نے آنکھیں جھکاتے ہوئے کہا ــــ "اب ہم کہاں جائیں گے؟"

"جہاں کسی کو کچھ معلوم نہ ہو۔ جہاں ہمیں شرم نہ آئے اور جہاں ہم پاکیزہ زندگی بسر کر سکیں۔"

ہردیال نے نرملا کے چہرے کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ تو خود بھی شرمندگی کے خوف سے اور مستقبل کا خیال کر کے پریشان ہو رہا تھا تاہم جب اُس نے ڈرائیور کے سامنے لگے ہوئے آئینے کی طرف نگاہ اٹھائی تو اُس نے صاف طور پر دیکھ لیا کہ نرملا کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔

ہردوار پہنچ کر بھی ہردیال نے نرملا سے کچھ نہیں پوچھا۔ البتہ نرملا نے خود ہی بتا دیا کہ خاوند کی زندگی میں ہی اُس کے میکے شہر کا ایک رئیس برج کشور اُسے پریشان کیا کرتا تھا خاوند کے مرنے کے بعد وہ بریلی پہنچی تو اُس کے ہاتھ چڑھ گئی اور ایک دن اُس کی ترغیب

پر بھاگ کر اُس کے ساتھ آگئی اور اِس مصیبت میں پھنس گئی۔ اب اُس کی خواہش اِس کے سوا کچھ نہیں کہ بیٹے کی آنکھوں کے سامنے اُس کی زندگی ختم ہو جائے۔

ہر دیال نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "یہ کرموں کا پھل ہے ماں۔ میں نے پچھلے جنم میں بُرے کرم کئے ہوں گے تو مجھے اِس جنم میں سزا ملی۔ تم نے بھی کوئی قصور کیا ہوگا اِسلئے یہ دن دیکھنے میں آئے۔ پرماتما کی کرپا ہوئی ہے کہ ہم دونوں نئی زندگی میں داخل ہو گئے ہیں اب ہم دونوں کو پشچاتاپ کرکے نئی زندگی شروع کرنی چاہیئے۔ میرے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی"۔

نرملا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ماں ہوتے ہوئے بھی اُس نے اپنا سر ہر دیال کے قدموں پر رکھ دیا۔ کہنے لگی ——" تم دھنیہ ہو بیٹا! بھگوان بھی جن گناہوں کو شاید معاف نہ کرتا وہ تم نے ذرا سی بات پر معاف کر دیئے میں یہ احسان مر کر بھی بھول نہیں سکوں گی"۔

نرملا کو اپنے ماضی کے رویّہ اور اپنی شرمناک زندگی کی وجہ سے دُکھ ہو رہا تھا اور ہر دیال اِس خیال سے پریشان تھا کہ دونوں کا مستقبل کیا ہوگا۔ نرملا نے گناہ کئے تھے۔ مگر ہر دیال نے بھی شریف آدمیوں کی زندگی بسر نہیں کی تھی۔ اگر وہ نئی زندگی بسر کرنا بھی چاہے تو کیا مولوی عبدالجبّار خاموش رہے گا۔ اُسے پریشان نہیں کرے گا۔

دسواں یا گیارھواں دن تھا۔ وہ دونوں رشی کیش اور دُوسرے استھانوں کی یاترا کرکے واپس آئے ہوئے تھے۔ صبح سویرے ہر دیال بستر سے اُٹھا تو نرملا غائب تھی۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ یکایک اُس نے دیکھا تو کرسی پر ایک لفافہ پڑا تھا۔ اُس نے چونک کر اُسے اُٹھایا اور کھولا۔ لکھا تھا۔

"گھنشیام!

تم نے مجھے ذلّت کی زندگی سے چھڑا کر عزّت دی۔ یہ ایسا احسان ہے کہ بار بار جنم لوں تو بھی نہیں اُتار سکتی۔ خاص طور پر اِس وجہ سے کہ میں نے ماں ہوتے ہوئے بھی تمہیں ایک لمحہ کے لئے سُکھ نہیں دیا۔ میرے لئے جینا بیکار ہے۔ جب تک میں زندہ رہوں گی میری آتما مجھے ذلیل کرتی رہے گی۔ میں مرنا چاہتی ہوں۔ اِس سنسار کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینا چاہتی

ہوں۔

میرے پاس کچھ روپیہ نہیں۔ جو تھا وہ ضائع کر چکی ہوں۔ تمہارے باپ کا مکان تمہارے لئے ہے۔ یہ میں پہلے ہی لکھ چکی ہوں۔ تمہارے نانا بھی مرنے سے پہلے فارغ خطی منسوخ کر گئے تھے۔ ہمیشہ کے لئے رخصت لیتی ہوں۔ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش بے کار ہوگی۔

تمہاری ظالم ماں۔ نرملا"

ہردیال کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ بھاگا گنگا کی طرف۔ اُس نے وہ تمام ٹھکانے ڈھونڈ مارے جہاں اُس کے جانے کا اندیشہ ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ نہ ملی اور جب دن بھر کی تلاش کے بعد اُسے رات کو تھانہ سے معلوم ہوا کہ ایک عورت پاؤں پھسل کر گنگا میں ڈوب گئی ہے تو وہ رو اٹھا۔ نرملا نے اپنے پاپوں کا کفارہ کر دیا تھا۔ اُسے بیٹے کی حیثیت سے آخری رسوم ادا کرنی تھیں، جو اُس نے آنسوؤں کی دھاریں بہا بہا کر پوری کر دیں۔

زندگی پھر نئے دوراہے پر تھی۔ کہاں جائے؟ دہلی کا رُخ اختیار کرے یا لکھنؤ کا؟ مولوی عبدالجبار کا ساتھ چھوڑ دے یا نہیں؟

اُس نے موجودہ زندگی کو ایک لعنت سمجھا اور اپنے آپ کو کوسنا شروع کر دیا۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا — لعنت ہی تو ہے۔ نہ جانے نرملا کی طرح کتنی مائیں اور بہنیں مجھ جیسے انسانوں کی ہوس رانی کا شکار ہوتی ہیں۔ اِس لئے اِس دھندے میں پڑ کر کیوں گناہ کیا جائے اور پھر اُس نے سوچا — میں نے اپنی مرضی سے تو یہ راستہ اختیار نہیں کیا تھا۔ ایک حادثہ ہی تھا جس نے میری زندگی بدل دی۔ اب اگر میں چاہوں تو یہ زندگی پھر سے کیوں بدل نہیں سکتی۔ ایک مکان موجود ہے اُسے فروخت کر کے ایک شریف آدمی کی زندگی بسر کرنا مشکل تو نہیں۔

مشکل ایک ہی تھی اور وہ یہ کہ اگر وہ سیدھا لکھنؤ چلا جائے تو مولوی عبدالجبار اُس کا پیچھا کرے گا۔ مولوی عبدالجبار بڑے اثر و رسوخ کا مالک ہے۔ اُس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں اور اگر وہ اُس کے پیچھے پڑ گیا تو اُس کی خیر نہیں۔

انھیں خیالات میں پریشان وہ اپنی رہائش گاہ سے باہر نکلا۔ گنگاگھاٹ کی طرف جانے لگا کہ اُس نے ایک اخبار فروش کو زور زور سے چلّا کر اخبار بیچتے دیکھا۔ اخبار لے کر اُس نے پڑھنا شروع کیا تو ایک خبر دیکھتے ہی ٹھٹک گیا۔ خبر کچھ اس طرح تھی۔

"دہلی کے مشہور ایڈوکیٹ کا سنسنی خیز قتل

لاش موٹر کار میں جمنا پل کے قریب ملی"

اخبار کے نامہ نگار نے لکھا تھا کہ دہلی کے مشہور ایڈوکیٹ لالہ رام پرشاد سری واستو کی لاش آج صبح جمنا میں اُن کی اپنی کار میں پڑی ہوئی ملی۔ لاش پر گہرے زخموں کے نشان تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے اُنہیں تیز دھار آلے سے ہلاک کر کے موٹر پوری رفتار سے جمنا میں چھوڑ دی۔ اتفاق سے موٹر اس پار کنارے میں ریت میں پھنس گئی صبح سویرے لالہ گلزاری مل سیشن جج نے سیر کرتے ہوئے موٹر دیکھی تو پولیس کو اطلاع دی۔ پولیس نے کار باہر نکالی تو اُس میں لالہ رام پرشاد کی لاش بھی ملی۔ سارے دہلی میں اس واقعہ سے سنسنی پھیل گئی ہے۔ لالہ رام پرشاد سری واستو نہ صرف ایک مشہور ایڈوکیٹ تھے بلکہ شہر کی ایک معزز ہستی بھی تھے کئی جماعتوں سے اُن کا تعلق تھا۔ ہر شخص اُن کے اس بے جا نہ قتل پر افسوس ظاہر کر رہا ہے۔

ہر دیال خبر پڑھتے ہی چونک پڑا۔ لالہ رام پرشاد کا قتل اُس کے لئے بھی تعجب انگیز تھا کیونکہ لالہ رام پرشاد مولوی عبدالجبار کے ساتھیوں میں سے تھے۔ دُنیا انہیں کچھ ہی کیوں نہ سمجھے۔ یہ حقیقت تھی کہ مولوی عبدالجبار کی طرح لالہ رام پرشاد بھی پورے گھاگ تھے۔ بردہ فروشی، کوکین فروشی اور اسی طرح کے دوسرے دھندوں میں اُن کا بھی حصّہ تھا۔ تاہم انہیں کسی نے قتل کر دیا۔

ہر دیال نے دِل ہی دل میں سوچا۔ اُسے یاد آیا کہ کچھ دن پہلے مولوی عبدالجبار کا لالہ رام پرشاد سے جھگڑا ہوا تھا اور مولوی صاحب نے کھلے بندوں دھمکی دی تھی کہ اگر انہوں نے اپنا رویہ تبدیل نہ کیا تو وہ انہیں سیدھا کر دیں گے اور پھر اُسے یاد آیا کہ اس واقعہ سے کچھ دن بعد مولوی صاحب اپنے ایک شاگرد سے کہہ رہے تھے کہ وہ لالہ رام پرشاد کو

کسی طرح دھوکے سے گرفتار کرائے۔ ہرد یال نے سوچا۔ ہو نہ ہو یہ مولوی عبدالجبار کی کارستانی ہے۔ اُس نے لالہ رام پرشاد کو راستے کا کانٹا سمجھ کر ختم کر دیا ہوگا۔ اس سے پہلے بھی تو اُس نے اپنے ہی ایک ساتھی کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ یہ بات اُس نے اُسے جیل میں ہی بتادی تھی لیکن اُس کے بعد اُس نے نہ معلوم کس طرح اپنی بے گناہی ثابت کر دی اور برّیت حاصل کر لی۔

ہرد یال چلتے چلتے گنگا کے کنارے پہنچ گیا تھا۔ شام کا وقت تھا اور رات کے تاریک سائے آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے۔ ہر کی پوڑی پر بیٹھ کر اُس نے جوتے اُتار دیئے اور اپنے پاؤں گنگا کے شیتل جل میں ڈال دیئے۔ مندروں کے گھڑیالوں کی آواز سے فضا گونجنے لگی۔ ساتھ ہی ہریانہ کے علاقے کی کچھ عورتیں بھگتی اور شردھا کے جذبات سے بھرپور گیت گا رہی تھیں۔ ہرد یال نے اخبار رکھ دیا اور گنگا کی اُچھلتی ہوئی لہروں کا نظارہ کرنے لگا۔

گنگا کا نرمل شیتل جل اور نرمل خاموش فضا۔ وہ پھر غور و فکر کے سمندر میں ڈوب گیا اُس نے سوچا ــــ کچھ ہی ہو اُسے اِس زندگی کو ترک کر دینا چاہیئے۔ وہ نوجوان ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ ابھی کچھ بگڑا بھی نہیں۔ روپے کے انتظام کی صورت بھی بن گئی ہے اِسلئے اُسے خاموشی سے کنارہ کشی کر کے شریف آدمیوں کی زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ مولوی عبدالجبار بہت سخت آدمی سہی لیکن اُسے نگل تو نہیں جائے گا۔ اور پھر اُسے معلوم ہی کیونکر ہوگا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے؟

نواں باب

ہر دیال پھر گھنیشام بن گیا۔ وہی گھنیشام جو ایک سیدھا سادھا شریف نوجوان تھا اُس نے ہردوار سے ہی نرملا کے والدین کو سارے واقعہ کی چٹھی لکھ دی تھی۔ نرملا خود کشی سے پہلے خود بھی ایک چٹھی لکھ چکی تھی۔ اِسلئے اُسے لکھنؤ پہنچ کر کوئی خاص مشکل پیش نہ آئی وکیل صاحب اُس کا مکان خریدنا چاہتے تھے۔ گھنیشام نے ۷۵ ہزار میں سودا کر لیا اور خود لکھنؤ چھوڑ کر کلکتہ چلا گیا جہاں اُس نے کالج میں داخل ہو کر بی۔ اے پڑھنا شروع کیا۔ بی۔ اے کے بعد اُس نے لا پاس کیا اور نواکھلی کے ایک زمیندار ستیندر بابو کی لڑکی کملیش سے شادی کر لی۔ ستیندر بابو ایک اچھے خاصے زمیندار تھے۔ کئی گاؤں کے مالک تھے۔ سیکڑوں مزارعے اُن کی زمینوں پر کام کرتے تھے۔ کملیش اُن کی اکلوتی بیٹی اور اکلوتی اولاد تھی۔ اُسے بڑے لاڈ و پیار سے پالا تھا اور شانتی نکیتن میں تعلیم دلائی تھی۔ بڑھاپے میں اکلیش اور گھنیشام کے سوا اُن کے لئے اور کون رہ گیا تھا۔ دونوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے۔

کملیش کو پا کر گھنیشام کی زندگی بھی بالکل بدل گئی تھی۔ اب وہ زمیندار بابو کا داماد تھا۔ اُن کی تمام زمینداری کا ہونے والا وارث۔ اتنی دولت مل جانے پر بھی اُس کے مزاج میں فرق نہیں آیا۔ اُسے اُن دنوں کی یاد نہ بھولی جب وہ سوتیلی ماں کے ہاتھوں گھر سے نکالا گیا تھا اور زمیندار بابو نے ہی اُسے پناہ دی تھی۔ ستیندر بابو کا گھر جمائی

بننے کے باوجود وہ ساوتری کو بھولا نہیں تھا۔ اُس کی یاد برابر آتی کئی بار وہ کام کرتے کرتے کھانا کھاتے کھاتے یا کملیش سے باتیں کرتے کرتے چونک پڑتا۔ کملیش پوچھتی "آخر اس میں ایسی کون سی بات تھی جو تم اُسے فراموش نہیں کر سکتے؟"

گھنیشام ایک ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہو جاتا۔ کملیش ناراض نہ ہو جائے اس خیال سے بات چیت کا رُخ بدل دینے کی کوشش کرتا۔ لیکن کبھی کبھار ہنسی مذاق کے ماحول میں وہ کہہ بھی دیتا۔ "تم کیا جانو وہ کتنی رحم دل اور ہنس مکھ لڑکی تھی۔"

"رحم دلی تو اِس بات سے ظاہر ہے کہ اپنے باپ کو تمہارے خلاف شہادت دینے سے روک نہیں سکی۔" کملیش بگڑ کر کہتی۔

"وہ محض غلط فہمی تھی۔" گھنیشام سنجیدگی سے کہتا۔ "اگر اُسے صحیح واقعے کا علم ہوتا تو وہ ہرگز باپ کو گواہی دینے کے لئے جانے نہ دیتی۔"

"اچھا مان لو یہی درست تھا۔" کملیش کہتی ــــ "تو پھر تم سے اُس نے خط و کتابت کرنے کی ضرورت کیوں نہ سمجھی؟"

گھنیشام کہتا ــــ "اُسے کیا معلوم کہ میں کہاں ہوں۔ اگر ایک بار مل جائے اور اُسے صحیح معاملات کا علم ہو جائے تو وہ ضرور اپنی غلطی کا اعتراف کرے۔ ضرور معافی مانگے۔"

"اور پھر ــــ تم مجھے چھوڑ کر اُس کو اپنے من مندر کی رانی بنالو۔" کملیش ذرا بگڑ کر کہتی ــــ "یہی تمہارا مطلب ہے نا؟"

گھنیشام اُس کی گال پر ایک ہلکی سی چپت لگا کر مسکرا کر کہتا ــــ "تم تو خواہ مخواہ بگڑ جاتی ہو۔ بات یہ ہے کہ مجھے ساوتری سے واقعی اُنس ہے۔ مجھے واقعی اُس کی یاد آتی ہے لیکن اگر میرا مندر ہے تو اُس کی رانی تمہارے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔"

کون کہہ سکتا ہے کہ کملیش کو اِس بات پر یقین آتا تھا یا نہیں لیکن یہ بات بھی نہیں کہ اُسے ساوتری کا نام سن کر نفرت ہونے لگ گئی تھی بلکہ ساوتری کی تعریفیں سننے کے باوجود کئی مرتبہ اُسے خیال آتا کہ اگر وہ اُسے مل جائے تو وہ اُس سے ضرور دل

کھل کر باتیں کرے۔ دیکھئے تو سہی کہ آخر اُس میں وہ کون سی خوبیاں ہیں جو اُس کے پتی دیوکئی سال گزر جانے کے باوجود بھُول نہیں سکے ——— اور اگرچہ گھنیشام اس ذرا سی بات چیت کے نتیجے میں بگڑتے دیکھ کر سیر یا سنیما کے لئے ساتھ لے جاتا لیکن وہ سوچتا رہتا کہ اگر زندگی کے کسی موڑ پر ساوتری مل جائے تو کیا ہو ——— یہ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ لیکن واقعی مل جائے تو اُسے مسرت ہوگی۔ بے حد مسرت۔ وہ شاید اپنے جذبات پر قابو پا نہ سکے۔ شاید وہ اُس سے گلے مل جائے۔ شاید وہ اُسے اپنے آپ سے کبھی علیحدہ نہ کر سکے لیکن ......

کملیش کا خیال آتے ہی وہ سوچنے لگتا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ آخر کملیش نے کون سا قصور سرزد کیا ہے کہ وہ اُس کی وجہ سے پریشان ہو۔ کملیش تو اُسے جی جان سے محبت کرتی ہے۔

شادی کے چھٹے یا ساتویں مہینے ستیندر بابو سیڑھیوں سے گر کر ایسے زخمی ہوئے کہ ہزار کوشش کے باوجود صحتیاب نہ ہو سکے۔ اُنہیں ذیابیطس کی پُرانی بیماری تھی جس نے زخم بھرنے نہ دیئے۔ ڈاکٹروں نے بہتیرا علاج کیا لیکن کوئی دوا کارگر نہ ہوئی دیوالی کی رات تھی جب سارے نواکھلی میں خوشیوں کے دیئے جل رہے تھے ایک دیا ایسا بُجھا کہ پھر روشن نہ ہو سکا۔

ڈاکٹروں نے کہا ——— "ہمیں افسوس ہے کہ زمیندار بابو چل بسے۔"

کملیش نے سر پیٹ لیا۔ گھنیشام کو بھی سخت صدمہ پہنچا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا تقدیر نے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ گھنیشام کریا کرم سے فارغ ہوا تو اُس نے وکالت چھوڑ دی کیونکہ اُسے ستیندر بابو کی زمینداری کا دھندا سنبھالنا پڑا۔

گھنیشام کے لئے یہ سب باتیں نئی تھیں۔ اُسے زمینداری کے کام سے نہ تو دلچسپی تھی نہ ہی وہ اُس کی پیچیدگیوں کو سمجھتا تھا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر کوئی ملازم یا مزارعہ اُس کے پاس کوئی شکایت لے کر آتا تو وہ فوراً اُس کی امداد کرتا۔ دوسری طرف اگر دفتر کے آدمی مزارعوں کے خلاف کوئی تجویز پیش کرتے تو اُن کی بات بھی مان لیتا۔ کملیش یہ

حالت دیکھ کر پریشان ہوتی اور اپنے مشورے پیش کرتی۔ لیکن گھنیشام اُن مشوروں کی چنداں پروا نہیں کرتا تھا۔ اس لئے آہستہ آہستہ یہ ہونے لگا کہ آمدنی کم ہونے لگی اور اخراجات زیادہ۔ گھنیشام کے دوست احباب کا حلقہ وسیع ہو رہا تھا اور آئے دن بنگلہ پر یا راج میں کوئی نہ کوئی محفل جمی ہی رہتی۔ گھنیشام خود تو شراب کا عادی نہیں تھا لیکن یار دوست کب باز آنے والے تھے۔ گھنیشام کو ان کی فرمائش پوری کرنی پڑتی۔ شراب آتی اور اس کے دَور چلتے۔ گانے اور ناچ ہوتے۔ گھنیشام کا خرچ ہوتا۔ دوسرے لوگ عیش کرتے اور گھنیشام کی واہ واہ ہوتی۔

کملیش یہ باتیں سنتی تو بہت کُڑھتی اور گھنیشام کو روکنے کی کوشش کرتی لیکن گھنیشام مُسکرا کر کہتا ــــ "آخر یہ دولت بھی دوسروں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ اگر کچھ لوگوں میں تقسیم ہو جائے تو اس میں ہرج ہی کیا ہے؟"

"تمہارے لئے کیا ہرج ہے لیکن یہی حالت رہی تو ایک دِن ہمیں کوڑی کوڑی کا محتاج ہونا پڑے گا" کملیش ناراض ہو کر کہتی۔

اور گھنیشام مُسکرا کر کہتا ــــ "میں سب کچھ جانتا ہوں۔ تم جسے فضول خرچی کہتی ہو اس سے تعلقات بڑھتے ہیں۔ دوستوں اور واقفکاروں میں اضافہ ہوتا ہے جس سے احباب کا حلقہ وسیع ہو اس سے کبھی نقصان نہیں ہوتا۔"

کملیش یا تو خاموش ہو جاتی یا ستیندر بابو کو یاد کر کے آنسو بہانے لگتی۔ گھنیشام اس موقع پر اس سے محبت کی باتیں کرتا اور سنیما یا تھیئٹر کو لے جاتا اور اس طرح سے یہ معاملہ ٹل جاتا۔

گھنیشام کے دوستوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ اُن میں سے ایک تھے شیلندر کمار بیرسٹر۔ کلکتہ میں رہتے تھے۔ لیکن اُن کا باپ پونا میں ایک سرکاری دفتر میں سپرنٹنڈنٹ تھا۔ شادی بمبئی میں ہوئی تھی اور اکثر چھوٹے موٹے مقدّموں میں پیش ہونے کے لئے نواکھلی اور دُوسرے قصبوں میں جاتے تھے۔ ایک ایسے ہی مقدّمے کے سلسلے میں آئے تھے تو گھنیشام سے ملاقات ہوئی۔ یار دوستوں نے ناچ کی محفل منعقد کی اور اس کے

بعد تعلقات اِس قدر بڑھتے گئے کہ شیلندر بابو جب بھی نواکھلی آتے گھنشیام کے ہاں ہی ٹھہرتے اور ناچ ورنگ کی محفلیں ہوتیں۔

شیلندر بابو کے اصرار پر گھنشیام کلکتے گیا۔ کلکتے اُس کے سسر کا بھی ایک مکان تھا۔ اُس مکان کا کرایہ گھنشیام کے کارندے ہی وصول کرتے تھے۔ گھنشیام کلکتے گیا تو شیلندر بابو کے ہاں ہی ٹھہرا۔ شیلندر بابو کے بچے کا جنم دن تھا۔ اکلوتا بچہ تھا۔ اِس لئے سارے پریوار کو اُس سے محبت تھی۔ شیلندر کے بھائی ہریش بابو، اُس کی چھوٹی بہن جوتیکا اور اُن کے بہنوئی سریندر بابو بھی آئے ہوئے تھے۔ شیلندر بابو نے سب سے گھنشیام کا تعارف کرایا۔ مہمانوں میں یہ پی کے ایک صاحب بھی تھے۔ شیلندر بابو نے کہا ــــ "یہ ہیں گوپی ناتھ بابو کانپور کے ایڈووکیٹ اور نینی تال کے زمیندار سرِیش بابو کے داماد۔"

گھنشیام نے چونک کر کہا ــــ "سرِیش بابو کے داماد ــــ! آپ کی کب شادی ہوئی؟"

"جی کوئی دو سال ہوئے۔" گوپی ناتھ بابو نے مسکراتے ہوئے کہا ــــ "کیا آپ سرِیش بابو کو جانتے ہیں؟"

"نہیں۔" گھنشیام نے بناوٹی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ "اُن کا نام سُن رکھا ہے۔"

گھنشیام نے غور سے دیکھا ــــ گوپی ناتھ بابو کی عمر چالیس پینتالیس کی تھی۔ بال سفید ہو رہے تھے۔ ایک آنکھ میں کچھ نقص بھی تھا۔ اُس نے سوچا ــ یہ کیا ماجرا ہے ــــ سرِیش بابو نے اِس شخص سے اپنی لڑکی کی شادی کیونکر کر دی۔

اور پھر اُس نے سوچا ــــ شاید ساوتری بھی آئی ہے۔ اگر وہ نظر آجائے تو....

شیلندر بابو مہمانوں کے سواگت اور اُن کی خاطر تواضع میں مصروف تھے۔ اُدھر گھنشیام کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ گوپی ناتھ بابو کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اُس نے پوچھا "سرِیش بابو آجکل کہاں ہیں؟"

سورگباش ہو گئے۔"

"کب؟"

"تین سال ہو گئے۔" گوپی ناتھ بابو نے کہا۔ "بڑے نیک انسان تھے۔ اسی لئے تو اُن کے بھائی نے چال چل کر تمام زمینداری اپنے نام منتقل کرالی۔"

گھنشیام کا اشتیاق بڑھنے لگا۔ اُس نے پوچھا ــــ "تو کیا اُن کی لڑکی کو کچھ بھی نہیں ملا؟"

"ملتا کیا۔" گوپی ناتھ نے سنجیدگی سے کہا۔ "رائے بہادر کے بس کی بات ہوتی تو ساوتری کی زندگی بھی ختم کر دیتے۔"

"تو معاملہ یہاں تک پہنچ گیا تھا؟" گھنشیام نے کہا ــــ "مگر آپ تو ایڈووکیٹ ہیں مقدمہ لڑتے تو شاید کامیاب ہو جاتے۔"

"وہ تو ہو ہی رہا ہے مگر مشکل یہ ہے کہ ہم اتنے دولتمند نہیں کہ مقدمے کے اخراجات برداشت کریں۔ دوسرے رائے بہادر کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ اگر اُن کا بس چلے تو ہمیں دنیا کو ختم کرا دیں۔"

گھنشیام پوچھنا چاہتا تھا کہ ساوتری کہاں ہے۔ یہاں آئی ہے یا نہیں؟ لیکن وہ یہ تو پوچھ نہ سکا۔ اُسے جرأت ہی نہ ہوئی۔ اُس نے سوچا کہ اگر وہ ساوتری کے متعلق باتیں چھیڑے تو شاید گوپی ناتھ کو شک گزرے کہ وہ اُس کے گھریلو معاملات میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے۔

اور اُس رات رقص و سرود کی محفل منعقد ہوئی تو اُس نے گوپی ناتھ بابو کو اپنے اصلی رنگ میں دیکھا۔ اُس سے پہلے تو اُس نے یہی سمجھا تھا کہ وہ اُدھیڑ عمر ہونے کی وجہ سے ساوتری کے لائق نہیں لیکن اب اُسے یقین ہو گیا کہ گوپی ناتھ بابو اوّل درجے کے اوباش ہیں۔ گوپی ناتھ بابو نے اتنی شراب پی تھی اور اس قدر واہی تباہی بک رہے تھے کہ گھنشیام کے دل پر سخت چوٹ لگی اور اس صدمے نے اُس کے دل میں ایک مرتبہ پھر محبت کی آگ بھڑکا دی۔

اُس رات اُسے نیند نہیں آئی۔ ماضی کے تمام واقعات سینما کی تصویروں کی طرح اُس

کے دماغ میں آنے لگے۔ اُسے یاد آئی وہ پہلی ملاقات جب ساوتری نے ہمدردی کے لہجے میں اُسے "ماسٹر جی" کہہ کر پکارا تھا۔ اور پھر وہ دن جب دونوں میں محبت کے عہد و پیمان ہوئے تھے۔ اُس کا سر چکرانے لگا۔ کچھ نہ سمجھ سکا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ ساوتری کے دل میں شاید ماضی کے واقعات جاگ اُٹھیں۔ لیکن کیا وہ اُس سے اب بھی محبت کرے گی۔ کیا وہ خود اپنی بیوی کی موجودگی میں دوسری بیاہتا عورت سے محبت کر سکتا ہے؟ وہ اِس سوچ میں پڑ گیا۔

دسواں باب

گھنیشام کو یہ معلوم کرنے میں مشکل پیش نہ آئی کہ گوپی ناتھ بابو تین چار مہینوں سے کلکتہ میں ہی آئے ہوئے ہیں اور ساوتری بھی اُن کے ساتھ ہی بیرسن روڈ کے ایک فلیٹ پر رہتی ہے لیکن اُسے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ گوپی ناتھ بابو اپنا گذارہ کیونکر کرتے ہیں۔ شیلندر بابو نے اُسے اِتنا ہی بتایا تھا کہ گوپی ناتھ مالدار اسامی ہے۔ کچھ کام ضرور کرتا ہے اور اکثر یہ مختلف شہروں کے چکر کاٹتا رہتا ہے۔ لیکن شیلندر بابو نے بھی یہ جاننے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کی کہ یہ کاروبار کس قسم کا ہے۔

گھنیشام کلکتہ سے نواکھلی لوٹ آیا۔ اُس نے ساوتری سے ملاقات نہیں کی لیکن اِس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ملاقات کرنا نہیں چاہتا تھا بلکہ بے حد غور و فکر کے باوجود اُس کے ذہن میں کوئی ایسی تجویز نہیں آئی وہ کس طرح ملاقات کرے۔ نہ ہی وہ سمجھ سکا کہ اس ملاقات کا ردِعمل کیا ہوگا۔

گھر آیا تو اُداس اُداس تھا۔ کملیش نے باتوں ہی باتوں میں اُس سے پوچھا لیکن اُس نے مسکرا کر ٹال دیا۔ لیکن نہ جانے کیوں زندگی میں پہلی بار کملیش کو محسوس ہوا کہ یہ مسکراہٹ مصنوعی ہے اور اس کے پیچھے کوئی مایوسی چھپی ہوئی ہے۔

دوسرے یا تیسرے دن کی بات تھی۔ کملیش نے پوچھا۔ "تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ کہیں پھر ساوتری کی یاد تو پریشان نہیں کر رہی؟"

گھنیشام ابھی تک رات کا لباس ہی پہنے ہوئے تھا۔ اُس نے اخبار پر سے نگاہ ہٹاتے ہوئے چونک کر کہا — "کیا بات ہے؟"

"میں پوچھتی ہوں کماری جی کا خیال تو پریشان نہیں کر رہا؟" کملیش نے کھڑے ہی کھڑے پھر پوچھا۔

"کون کماری؟" گھنیشام نے کہا "تمہیں وہم تو نہیں ہو گیا؟"

"خیر ان باتوں کو جانے دو میں تو پوچھتی ہوں کہ تم کلکتہ سے واپس آکر اُداس اُداس کیوں رہنے لگے ہو۔ نہ میرا خیال ہے نہ زمینداری کا؟"

گھنیشام نے کوئی جواب نہ دیا — کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد اُس نے کہا — "زمینداری سے تم جانتی ہو مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوئی مصیبت آ پڑی ہے اسلئے نبھا رہا ہوں اور جہاں تک تمہارا تعلق ہے...؟"

"مجھ سے کوئی محبّت نہیں"۔ کملیش نے بات کاٹتے ہوئے کہا — "یہی کہنا چاہتے ہو نا۔ میرے ماں باپ نہیں اسی لئے تو...؟" کملیش کا گلا بھر آیا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکی اور آنسو پوچھتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

گھنیشام ہکا بکا رہ گیا۔ اُس نے کملیش سے کبھی سختی یا بیگانگی کا رویہ اختیار ہی نہیں کیا تھا۔ ساوتری کی یاد کے ستانے کے باوجود اُس نے کبھی اُس سے بے رُخی نہیں برتی تھی۔ اُسے غصّہ آگیا۔ جھنجھلاتے ہوئے اُس نے وہیں سے کہا — "اگر جان بوجھ کر روٹھنا ہی تمہاری عادت بن رہی ہے تو میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں بھی اس گھر سے جاتا ہوں۔ غلام بن کر نہیں رہ سکتا۔"

یہ کہہ کر جوں ہی اُس نے کپڑے پہنے اور شیو وغیرہ کا انتظار کئے بغیر چھڑی اُٹھا کر باہر نکلنے لگا، کملیش سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ اُس نے کہا — "کہاں جانے کا ارادہ ہے؟"

"جہاں بھی پیر لے جائیں گے چلا جاؤں گا۔" گھنیشام نے جھنجھلا کر کہا — "میں تنگ آچکا ہوں — تمہارا غلام بن کر نہیں رہ سکتا۔"

کملیش نے دروازہ بند کر دیا اور کواڑوں سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ گھنیشام کا ہاتھ

پکڑتے ہوئے اُس نے کہا — "تو اِس طرح تم یہاں سے نہیں جا سکتے۔ میں تمہیں ہرگز جانے نہیں دوں گی۔"

"میں بھی کہتا ہوں کہ میں ہرگز اس گھر میں نہیں رہوں گا۔" گھنیشام نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف ہٹاتے ہوئے اُس نے کہا — "ہٹ جاؤ۔ آج میں بھی فیصلہ کر چکا ہوں۔"

کملیش خاوند سے کشمکش کر رہی تھی کہ اچانک کسی کی آواز آئی — "گھنیشام بابو!"

دونوں چونک پڑے لیکن اِس سے پیشتر کہ گھنیشام نوکر کو آواز دے یا خود ہی جواب دے کمرے کا دروازہ کھُل گیا۔

گوپی ناتھ بابو اور ساوتری دونوں سامنے کھڑے تھے۔ گھنیشام کانپ اُٹھا۔ ساوتری کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

گوپی ناتھ بابو نے کہا۔ "یہ ہیں میری دھرم پتنی ....."

"میں جانتا ہوں۔" گھنیشام نے بات کاٹتے ہوئے کہا — اور ساوتری کی طرف دیکھ کر اُس نے کہا۔ "نمستے۔"

ساوتری نے بھی جو یہ منظر دیکھ کر حیران پریشان ہو رہی تھی، ہاتھ اُٹھائے اور "نمستے" کہہ کر کھڑی ہو گئی۔

عجب معاملہ تھا۔ ایک منٹ کے لئے تو گھنیشام کچھ فیصلہ نہ کر سکا کہ اب کیا کرے۔ اِس کے بعد اُس نے کملیش کو یہ کہتے ہوئے کہ تم اِن کو اپنے کمرے میں لے جاؤ، گوپی ناتھ بابو کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کمرے کے اندر قدم بڑھائے۔

ساوتری نے گھنیشام کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن گھنیشام نے پہلی ہی نظر میں دیکھ لیا تھا کہ ساوتری شرم سے پانی پانی ہو رہی تھی اور اگرچہ اس کی عمر بڑھ گئی ہے اور عمر کے ساتھ ہی قد بھی بڑھ گیا ہے تاہم اُس کے چہرے کے وہی نقش ہیں اور آنکھوں میں وہی چمک ہے۔

صوفے پر بیٹھتے ہوئے اُس نے کہا — "...یے گوپی ناتھ بابو۔ کیسے آنا ہوا۔ ہم غریبوں

پر کیونکر دیا آ گئی آپ کو؟

"آپ غریب ہیں!" گوپی ناتھ بابو نے زرد زرد دانت نکالتے ہوئے زور کا ایک قہقہہ بلند کرتے ہوئے کہا — "آپ تو نو اکھلی کے مالک ہیں۔ بنگال کے نامی زمیندار۔ آپ جیسے دو چار اور غریب نکل آئیں تو سارا بنگال کیا سارا ہندوستان خرید لیں۔"

گھنیشام ابھی تک اپنے آپ پر قابو نہیں پا سکا تھا۔ گوپی ناتھ بابو اکیلے آجاتے تو سوچا ہے وجہ کچھ بھی ہو کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ لیکن ساوتری کا اُن کے ساتھ آجانا ایک بُرا شگون تھا۔ بُرا اس لیئے کہ نہ تو ساوتری کو اِس کے متعلق کچھ معلوم تھا نہ ہی گھنیشام سمجھ سکا تھا کہ ابھی ابھی کملیش سے جو کھٹ پٹ ہو گئی تھی اُس کے بعد ساوتری کے اچانک آجانے سے جو غلط فہمی پیدا ہوگی اُسے کیونکر دُور کیا جا سکے گا۔

گوپی ناتھ بابو کو کچھ معلوم نہیں تھا نہ ہی وہ کچھ بھانپ سکتے تھے۔ اِس لیئے زیادہ بے تکلف ہونے کے لیئے انہوں نے کہا — "سنا تھا نو اکھلی میں آپ کا راج ہے اِسلیئے سوچا کہ چلو آپ کی میزبانی کا ہی لطف اٹھایا جائے۔ ساوتری بھی تنہائی کی وجہ سے پریشان تھی۔ اِس لیئے سوچا کہ آپ کے گھر آ کر اُس کا جی لگ جائے گا۔"

گھنیشام کو خاموش دیکھ کر گوپی ناتھ بابو نے کہا — "بھئی صاف صاف کہہ دو اگر ہمارا آنا بُرا لگا ہے تو ہم اُلٹے پاؤں لوٹ جاتے ہیں۔"

گھنیشام نے گوپی ناتھ بابو کی پیٹھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا — "حد کر دی آپ نے تو۔ مجھے اِس قدر کمینہ سمجھ لیا ہے آپ نے کیا؟"

اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر کوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکاتے ہوئے اُس نے کہا — "چائے پئیں گے یا کافی؟ اِتنے عرصے میں نہانے دھونے کا انتظام ہو جائے گا۔"

گوپی ناتھ وِسکی کے پجاری تھے۔ مگر انہوں نے ذکر نہیں کیا اور جب چائے آ گئی تو گوپی ناتھ بابو نے باتوں باتوں میں اپنی آمد کا مقصد ظاہر کر دیا۔ اگر انہیں کوئی اچھا کام کاج مل جائے یا بزنس کے لئے کچھ روپیہ مل جائے تو کلکتہ چھوڑ کر کسی دوسری جگہ کاروبار شروع کریں۔

گھنیشام کے لئے ملازمت مہیا کرنا مشکل نہیں تھا لیکن ماتحت ملازمت دینا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ساوتری اس کے نزدیک رہے۔ کیونکہ اس سے ایک ایسی آگ بھڑکنے کا اندیشہ تھا جو اس کے اپنے خرمن کو تباہ کر سکتی تھی۔ رہی مالی امداد۔ اس نے سوچا۔ ہو تو سکتی ہے لیکن اگر کملیش کو معلوم ہو گیا تو کیا اس سے غلط فہمی پیدا نہیں ہو گی۔

گوپی ناتھ بابو اور ساوتری کے لئے جانے والے مکان میں ٹھہرانے کا انتظام کرنے اور انہیں اپنی گاڑی پر وہاں پہنچانے کے لئے نوکر کو حکم دینے کے بعد جب وہ شیو کرنے کے بعد کپڑے پہننے لگا تو اس نے دیکھا کہ کملیش کواڑ کھول کر کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

کملیش کے چہرے پر اداسی کے علاوہ سنجیدگی بھی تھی۔ اس نے خاوند کے نزدیک آ کر کہا — "تو اب کیا پروگرام ہے تمہارا۔ جانے والے مکان میں جا رہے ہو گے نا؟"

"نہیں"۔ گھنیشام نے کہا ..... "مجھے ابھی دفتر میں کچھ کام کرنا ہے۔"

اور کملیش کو خاموش دیکھتے ہوئے اس نے کہا — "معلوم نہیں مصیبت کہاں سے آ گئی۔ مجھے تو ان لوگوں کے آنے کا کوئی خیال نہیں تھا۔"

"جی"۔ کملیش نے کہا — "یہ تو صاف ظاہر ہے۔"

کملیش کے لفظ اسے زہر کی طرح چبھے لیکن اس نے جانتے ہوئے کہ اسے غلط فہمی ہو رہی ہے اس نے کملیش سے کہا — "ادھر آؤ۔"

کملیش نزدیک آ گئی۔

گھنیشام نے اسے پکڑ کر صوفے پر اپنے نزدیک بٹھا لیا اور کہنے لگا — "اگر تمہیں میری باتوں پر وشواس ہو تو ایک بات کہوں؟"

"کہیے۔"

"میں پہلے کہتا ہوں کہ اگر آج بھی تم نے میری بات سمجھے بغیر شک کیا تو میں خودکشی کر لوں گا۔"

کملیش خاموش رہی۔

گھنیشام کہتا گیا — "بات یہ ہے کہ شیلندر بابو نے دعوت دی تھی تو وہاں ہی گوپی ناتھ بابو سے ملاقات ہوئی۔ اُن سے معلوم ہوا کہ ساوتری سے اُن کی شادی ہوئی تھی"

"کون ساوتری؟" کملیش نے حیرانی سے کہا — "یہ وہی ساوتری ہے کیا؟"

"ہاں" گھنیشام نے سنجیدگی سے کہا — "یہ وہی ساوتری ہے۔ وہی جس کا ذکر میں تم سے اکثر کیا کرتا ہوں لیکن تم سچ جانو کہ جب سے میں نینی تال سے آیا ہوں، آج پہلی بار اُس کی شکل دیکھی ہے۔ کلکتہ میں بھی نہیں دیکھا محض اِس لئے کہ نہ تو تمہارے دل میں کوئی غلط فہمی پیدا کرنا چاہتا ہوں نہ ہی اُس کا سکون برباد کرنا چاہتا ہوں۔"

اور پھر اُس نے کملیش سے پوچھا — "تم سے بھی ساوتری نے کوئی بات نہیں کی اور تم نے بھی کوئی بات نہیں پوچھی؟"

"نہیں" کملیش نے کہا — "نہ تو اُس نے ضرورت سمجھی نہ ہی میں نے۔"

گھنیشام نے ایک لمبا سا سانس لیا اور اُس کے بعد کہنے لگا — "اتفاق کی بات ہے یہ لوگ آ گئے ہیں۔ میں نے انہیں نہیں بلایا۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہو گیا ہو گا لیکن اِس کے باوجود اگر تمہیں غلط فہمی ہو تو یہ میری بدقسمتی ہے۔"

کملیش خاموشی سے سن رہی تھی۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید وہ ابھی تذبذب میں تھی۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ اگر اُس کے خاوند کی بات درست ہے تو کیا صبح یونہی جھڑپ ہو گئی تھی۔ کیا وہ محض ایک اتفاق کی بات تھی۔

گھنیشام نے بیوی کو غور و فکر کے سمندر میں ڈوبتے ہوئے دیکھ کر کہا — "یہ میں نہیں کہتا کہ مجھے ساوتری سے ملنے کی کبھی خواہش نہیں ہوئی۔ لیکن وشواس کرو کہ نہ تو اُس سے پہلے ملا ہوں نہ ہی اُسے بلایا ہے۔ اِس کے باوجود اگر تمہیں شک ہے تو میں پریشانی کی آگ میں جلنے کی بجائے مر جانا بہتر سمجھوں گا۔"

خاوند کی آنکھوں سے آنسو کے دو موٹے موٹے قطرے گرتے دیکھ کر کملیش کانپ اُٹھی۔ ہاتھ جوڑتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور خاوند کے قدموں پر گر کر رونے لگی۔

گھنیشام نے اُسے اُٹھا کر چھاتی سے لگا لیا اور کہنے لگا ۔ "تم کچھ بھی سمجھو لیکن یقین کرو کہ مجھے تم سے گہری ہمدردی ہے ۔ تمہاری زندگی برباد کرنے کا نہ تو مجھے حق ہے نہ ہی خواہش"۔

اُس شام جب گھنیشام نے کملیش کو باغ والے مکان میں چلنے کو کہا تو کملیش نہیں گئی ۔ اُس نے کہا ۔ تم جاؤ ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ۔ تم پر کوئی شک نہیں ۔ گھنیشام کے اصرار کے باوجود کملیش نہ مانی تو گھنیشام نے ایک ٹھنڈی سانس بھری ۔ کملیش کی محبت اور صدق دلی کے احساس سے اُس کے جسم میں گدگدی سی پیدا ہو گئی ۔

گوپی ناتھ بابو گھر پر نہیں تھے یہ بتانے پر جب ساوتری نے کہا: "آئیے" تو گھنیشام پریشان سا ہو گیا ۔ تذبذب میں اُس کے قدم رُک گئے اور وہ سوچنے لگا کہ اُسے کمرے کے اندر داخل ہونا چاہیئے یا نہیں ۔

ساوتری اُسے وہیں چھوڑ کر اندر داخل ہو رہی تھی ۔ اچانک اُس نے مڑ کر دیکھا گھنیشام اپنی جگہ پر رُکے ہوئے تھے ۔ وہ بھی رُک گئی ۔ اُس نے کہا ۔ "آپ رُک کیوں گئے ۔ آجائیے"۔

"گوپی ناتھ بابو" ۔ گھنیشام نے آہستہ سے کہا ۔

"آتے ہی ہوں گے"۔ ساوتری نے سنجیدگی سے کہا ۔ "آپ ذرا بیٹھئے ۔ وہ باہر گئے ہیں ۔ آنے ہی والے ہوں گے"۔

گھنیشام کے پاؤں خود بخود اُٹھ گئے ۔ کسی نامعلوم کشش سے وہ کمرے کے اندر داخل ہو گیا اور ساوتری کے اشارے پر صوفے پر بیٹھ گیا ۔

گھنیشام نے کہا ۔ "میں تو سوچتا تھا کہ تم مجھ سے ابھی تک ناراض ہو گی ۔ یہ ملاقات شاید تمہیں بُری لگی ہو مگر ..."

ساوتری خاموش رہی ۔

گھنیشام نے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ۔ "بات یہ ہے کہ جب سے تم لوگوں کو میرے متعلق غلط فہمی ہوئی تب سے میں تو شرمندہ ہوں ۔ تقدیر

کی بات تھی مصیبت کے چکر میں پھنس گیا ورنہ تم جانتی ہو کہ....."

"میں جانتی ہوں یا نہیں" ساوتری نے سنجیدگی سے کہا ــــ "اس سے کوئی فرق نہیں آسکتا۔ اتفاق کی بات تھی۔ تقدیر کے لکھے کو مٹانا مشکل ہو جاتا ہے۔ خیران باتوں کو چھوڑو۔"

"پتاجی چل بسے۔ میری دنیا تو اسی دن سے اجڑ گئی۔ رائے بہادر نے ہم لوگوں سے جو سلوک کیا وہ تو تمہیں معلوم ہو ہی گیا ہوگا۔ تمہارے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ یہاں آنے سے پہلے کچھ نہیں جانتی تھی۔ اب یہی پارتھنا ہے کہ تم لوگ ہمیں رخصت دو۔"

ساوتری کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

گھنشیام نے کہا ــ "کیوں کیا میری طرف سے کوئی زیادتی ہوئی ہے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں گھنشیام بابو۔" ساوتری نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ــــ "بات یہ ہے کہ میں خودہی شرمندہ ہوں۔ ایک وقت تھا تمہاری گرفتاری کے حالات سن کر تم سے نفرت ہو گئی۔ اتنے عرصے تک یہ بات ایک معمہ ہی رہی مگر آج صحیح حالات ہونے پر غلطی کا احساس ہوا تو تمہارے سامنے منہ کرنے کی ہمت بھی نہیں ہوتی۔"

گھنشیام کا دل دھڑک رہا تھا۔ شاید ساوتری کی بھی یہی حالت تھی۔ گھنشیام نے بات چیت کا رخ بدل دینا ہی مناسب سمجھا۔ اس نے کہا ــــ "تم لوگ یہاں ہی کیوں نہیں آجاتے۔" اور پھر اپنی غلطی کا احساس کرتے ہوئے اس نے کہا ــــ "میرا مطلب یہ ہے کہ اگر تم لوگ چاہو تو کلکتہ میں ہی کوئی کاروبار کر لو۔ گوپی ناتھ بابو نے آج صبح کچھ ذکر کیا تھا۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا ایسا کرنے سے انکار نہیں کروں گا۔"

ساوتری نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اپنی جگہ سے اٹھ کر الماری سے کچھ پھل ایک طشتری میں ڈال کر اس نے گھنشیام کے سامنے رکھ دیئے اور مسکرا کر کہنے لگی ــــ "ہم آپ کے مہمان ہیں لیکن اعتراض نہ ہو تو....."

"میں مہمان بن جاؤں" ــــ یہی مطلب ہے نا تمہارا؟"

اور پھر ساوتری کے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی اس نے طشتری سے پھل

اُٹھایا گوپی ناتھ بابو جھومتے جھامتے چھڑی لہراتے ہوئے کمرے میں داخل ہوگئے۔

"ہیلو گھنیشام بابو ـــــ" انہوں نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا ـــــ "میں تو سارا دن انتظار کرتے کرتے تنگ آگیا تھا۔ اِس لئے ذرا گھومنے کے لئے نکل گیا!"

گھنیشام سمجھ گیا کہ گوپی ناتھ بابو نشے میں ہیں۔ گھر پر شراب نہیں ملی تو بازار سے پی آئے ہیں۔ ساوتری غالباً یہ سمجھ کر شرمندگی کے مارے ایک طرف ہوگئی تھی۔ گھنیشام بھی پریشان تھا کہ اب کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

پتلون کی جیب سے شراب کی بوتل نکالتے ہوئے گوپی ناتھ بابو نے بیوی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "گلاس لاؤ ہم تینوں پئیں گے۔"

گھنیشام خاموش تھا اور ساوتری بھی۔ گوپی ناتھ بابو کا پارہ تیز ہوگیا۔ اُس نے ساوتری کو چھڑی دکھاتے ہوئے کہا ـــــ "لاتی ہو کہ نہیں!"

گھنیشام نے ساوتری کی آنکھوں میں بےبسی اور پریشانی بھانپ لی۔ اُس نے کہا ـــــ "گوپی ناتھ بابو میں تو شراب نہیں پیا کرتا اور تم بھی پی آئے ہو۔ اِس لئے آؤ دو قدم باغ میں گھوم آئیں۔"

گوپی ناتھ نے بڑھ کر ساوتری پر چھڑی سے ایک وار کیا اور چلّا کر کہا ـــــ "جانتی ہے کہ نہیں چڑیل!"

گھنیشام سے اب ضبط نہیں ہوسکا۔ ساوتری اب ضرب لگنے پر بیٹھ گئی تھی اور منہ چھپا کر رونے لگ گئی تھی۔ گوپی ناتھ بابو نے دوسرا وار کرنا چاہا تو گھنیشام نے بڑھ کر چھڑی چھین لی اور گوپی بابو کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔

گوپی ناتھ بابو کا جسم غصّے سے کانپ رہا تھا۔ گھنیشام اُسے باہر لے جانے لگا تو اُس نے چلّا کر کہا ـــــ "زندگی تلخ کر دی ہے اِس عورت نے۔ ذلیل باپ کی اولاد ذلیل ہی ہوتی ہے نا!"

گھنیشام کو اس قدر غصّہ آرہا تھا کہ اگر وقت کی مصلحت نہ ہوتی تو وہ گوپی ناتھ کے ہوش ٹھکانے لگا دیتا لیکن اُس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا ـــــ "غصّے

کو ٹھوک دینا چاہیئے گوپی ناتھ بابو ـــــ آؤ ذرا باغ میں چلیں۔"

باغ میں لوٹ کھڑاتے ہوئے شرابی گوپی ناتھ بابو نے واہی تباہی جاری رکھی۔ گھنشیام نے بات ٹالنے کے لئے باغ میں لانا ضروری سمجھا تھا۔ لیکن اُسے ایک طرف تو گوپی ناتھ بابو کی کمینگی پر غصہ آرہا تھا تو دوسری طرف ساوتری کی مظلومیت پر۔ اور پھر یکایک اُس نے سوچا کہ اِس کے کئی خطرناک پہلو بھی ہو سکتے ہیں۔ ساوتری سے گھر میں کچھ بھی سلوک کیوں نہ ہوتا ہو لیکن آج اُس کے سامنے اُس کی جو بے عزتی ہوئی اُس کا نہ جانے کیا نتیجہ نکلے۔ اِس لئے اُس نے گوپی ناتھ بابو کو دوسرے مکان میں لاکر اُسے سُلا دیا۔ اور خود ساوتری کی مدد لینے کے لئے روانہ ہو گیا۔

ساوتری فرش پر پڑی ہوئی ابھی رو رہی تھی۔ گھنشیام بابو کو دیکھ کر اُس نے چونک کر سر اٹھایا اور پھر اُٹھ کر آنسو پونچھ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

گھنشیام نے کہا ـــــ "مجھے بہت افسوس ہے کہ گوپی ناتھ بابو نے تمہاری بے عزتی کی۔ تمہارا خیال تھا۔ اسی لئے اُنہیں دوسرے مکان میں چھوڑ کر آگیا۔

ساوتری کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

گھنشیام نے کہا ـــــ "میرا خیال ہے کہ تم اِدھر ہی آجاؤ۔ کچھ دن تمہارا جی تو لگ جائے گا۔"

اور پھر ساوتری کو خاموش دیکھ کر اُس نے کہا ـــــ "مجھ سے شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے تم سے دلی ہمدردی ہے۔ ایک بار تم نے مجھے زندگی بخشی تھی۔ میں اُس کا احسان بھول سکتا ہوں کیا؟"

اور پھر اُس نے محسوس کیا کہ اُس کے دل میں جذبات کا طوفان بھڑک رہا ہے اُسے یاد آنے لگے وہ دن جب جذبات سے مغلوب ہو کر وہ پاگل سا ہونے لگتا تھا تو ساوتری مسکراہٹوں کی بارش کر کے اُسے ہوش کی دنیا میں لے آتی تھی۔

ساوتری نے سر جھکاتے ہوئے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "میرے نزدیک تم دیوتا ہو گھنشیام بابو! میں بہت شرمندہ ہوں۔ بہت ذلیل ہوئی ہوں اور ہوتی

رہتی ہوں۔ کئی بار سوچا کہ زندگی کا خاتمہ کر لوں لیکن پھر سوچتی ہوں کہ موت بھی تو آسان نہیں اور پھر کون جانتا ہے کہ مر کر بھی سکون حاصل ہو جائے گا؟"

اور پھر گھنشیام کی طرف سے کسی جواب کا انتظار کئے بغیر اُس نے کہا ــــ "تم مجھے اُن کے پاس پہنچا دو۔ میری فکر نہ کرو۔ میں تو ایک مدّت سے یہی زندگی بسر کر رہی ہوں۔ وہ اکیلے ہیں۔ مجھے وہیں پہنچا دو۔"

"لیکن....."

"تم اِس کی فکر نہ کرو۔ کچھ دیر بعد خود ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔" ساودتری نے مصنوعی ہنسی ہنستے ہوئے کہا ــــ "کل صبح ہم آپ کے پاس آئیں گے۔"

ساودتری اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ گھنشیام نے چاہا کہ ایک بار اُس کا بازو پکڑ کر اُسے بٹھا دے لیکن اُسے حوصلہ نہ ہوا۔ دروازہ بند کر کے اُس نے کہا ــــ "چلو ــــ"

گیارھواں باب

اُس روز شام کو جب گوپی ناتھ بابو کے پاس لے جاتے ہوئے اُس نے ایک جگہ چکنی زمین پر پھسلتی ہوئی ساوتری کو سہارا دینے کے لئے اُس کا بازو پکڑ لیا تھا تو نہ جانے کیوں اُس کے سارے جسم میں بجلی کی سی سنسنی پھیل گئی تھی۔ ساوتری نے ایک مانوس ہاتھ کی مس سے کیا محسوس کیا یا اُس کے دِل پر کیا گذری یہ اُسے معلوم نہیں ہو سکا۔ کیونکہ رات کی تاریکی میں وہ ساوتری کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو بھانپ نہیں سکا تھا۔ کمرے میں داخل ہو کر جب اُس نے دیکھا کہ شراب کے نشے میں مدہوش گوپی ناتھ کے پاس پہنچ کر ساوتری کا چہرہ شرم سے سیاہ ہونے لگا ہے تو اگرچہ اُس کا دِل کچھ اور کہہ رہا تھا لیکن جب ساوتری نے اُسے "اچھا نمستے" کہا تو وہ وہاں ٹھہرنے کی جرأت نہ کر سکا اور باہر نکل آیا۔

گھر لوٹتے ہوئے وہ سوچتا رہا اور گھر آکر بھی جب کملیش سے بات چیت ہوئی تو وہ ساوتری سے اپنی ہمدردی چھپا نہیں سکا۔ اُس نے تمام قصّہ بیان کرتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔ "امیر گھرانے میں لاڈ پیار سے پلی ہوئی اُس لڑکی کی حالت پر میرا دِل رو رہا ہے۔"

کملیش نے خاوند کے اِن لفظوں کو پسند نہیں کیا۔ قدرتی بات ہے کہ جس بیوی کو اپنے خاوند کی زندگی کے بیتے دِنوں کا علم ہو وہ اُس کی زبان سے ایسے لفظ سُن کر

خوش نہیں ہو سکتی۔ تاہم اُس نے وقت کا تقاضا دیکھ کر کوئی اعتراض نہیں کیا اور صرف اِتنا ہی کہا ـــــ کرموں کی گتی نیاری ہے۔ بھگوان بھلی کریں گے۔"

"بھگوان بھلی کریں گے" یہ لفظ بار بار گھنشیام کے دماغ میں گونجے لیکن وہ انتہائی غور و فکر کے باوجود اِس معمّہ کو سمجھ نہ سکا۔ اُس نے سوچا ـــــ آخر بھگوان کیوں کر بھلی کریں گے جس شخص کو شراب کی لت پڑ گئی ہے۔ جو دُوسروں کے سامنے بھی اپنی عزت کو ذلیل کرنے سے باز نہیں آتا وہ کیوں کر سُدھر جائے گا۔ کیونکر ساوتری کو ایسے خاوند کی موجودگی میں سکون اور مسرّت کی زندگی نصیب ہو گی۔

رات کو سوتے وقت بھی اُسے یہی خیال پریشان کرتا رہا۔ پریشانی کی وجہ اُس کا پس منظر بھی تھا۔ ایک حسین سا۔ بھولا بسرا سا جس کی یاد آتے ہی اُس کے جسم میں گدگدی سی پیدا ہونے لگی اور تصوّر در تصوّر کے ایک طویل سلسلہ میں وہ کبھی اپنے آپ کو ساوتری کے اِتنا نزدیک پاتا کہ اُسے ایسا لگتا گویا دونوں میں کوئی فرق ہی نہیں رہا۔ کوئی رکاوٹ ہی نہیں رہی۔ مظلوم سی، آنسوؤں کے دریا میں ڈُوبی ہوئی سی حسین سی معصوم سی لڑکی سے اُس کی ہمدردی محبّت کا طوفان لے آئی ہو گویا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اُسے یاد آجاتے اُس کے لفظ "میری فکر نہ کرو۔ میں تو ایک مُدّت سے یہی زندگی بسر کر رہی ہوں۔ وہ اکیلے ہیں۔ مجھے اُن کے پاس پہنچا دو" اور تب وہ محسوس کرتا کہ وہ محض اُس کی اپنی خود غرضی ہمدردی کا جامہ اوڑھ کر اُسے اُس کے نزدیک لے جا رہی ہے ورنہ ساوتری اُس سے دُور ہے کوسوں دُور۔

صبح اُٹھ کر اُس نے غیر معمولی بے چینی اور اضطراب کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا۔ اگر کملیش صبح سویرے ہی بیدار ہو کر اُس کے سامنے نہ آجاتی تو وہ غالباً گھر سے نکل کر گوپی ناتھ یا بو کے ٹھکانے پر پہنچ گیا ہوتا۔ لیکن اُس کی اُمیّدیں دھری کی دھری رہ گئیں بہت انتظار کرنے کے بعد جب اُس کے کہنے پر گئے ہوئے نوکر نے واپس آکر اطلاع دی کہ میم اور صاحب دونوں صبح صبح ہی موٹر منگوا کر چلے گئے ہیں تو گھنشیام کو ایسے محسوس ہوا گویا کسی نے اُس کے دماغ پر ہتھوڑے سے سخت چوٹ لگائی ہو۔ کملیش

نے اُسے روکنے کی کوشش نہیں کی اور اگر وہ روکتی تب بھی وہ نہ رُکتا۔ لیکن گوپی ناتھ بابو نہ تو کسی ہوٹل میں ملے نہ ہی سٹیشن پر۔ وہ سمجھ گیا کہ ساوتری نے شرمندگی کے مارے خاوند کو کسی طریقے سے تو اکھلی سے نکل جانے پر مجبور کر دیا ہوگا۔

کتنے ہی دن گذر گئے غور و فکر کے سمندر میں ڈوبے ہوئے۔ وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکا اُسے کیا کرنا چاہیئے۔ اُس نے کئی بار سوچا کہ ساوتری کو خط لکھے لیکن کوئی نامعلوم طاقت اُسے دوسرے لمحے ہی اِس خیال سے روک دیتی تھی۔ وہ سوچتا کہ کہیں وہ اُس سے ناراض ہی نہ ہو جائے۔ پھر وہ سوچتا ـــــ اِس میں ناراضگی کی بات ہی کیا ہے آخری ساوتری نے بھی تو ایک دفعہ اُسے زندگی بخشی تھی۔ آج وہ خود مصیبت میں ہے تو کیا اُس کا فرض نہیں کہ وہ اُسے حوصلہ دے۔ تاہم وہ لاکھ انکار کرے اِس غیر معمولی دلچسپی اور ہمدردی کے پیچھے ماضی کی رنگین داستانیں بھی تھیں جو اُس کے دِل میں ہلچل سی پیدا کر رہی تھیں۔ راتوں کو اُس کی نیند حرام کر رہی تھیں۔

ایسٹر کے دِنوں وہ کلکتہ جانے کا پروگرام بنا رہا تھا کہ شیلندر بابو کا خط آگیا۔ ان کے چھوٹے بھائی کی سگائی تھی اور شیلندر بابو نے تقاضا کیا تھا کہ وہ اِس تقریب میں ضرور شامل ہوں۔

کلکتہ پہنچ کر گھنشیام کو معلوم ہوا کہ گوپی ناتھ بابو ان دِنوں کلکتہ میں نہیں بلکہ کئی دن سے دہلی گئے ہوئے ہیں۔ میاں بیوی میں کچھ ناچاقی ہے جس کی وجہ سے ساوتری بہت پریشان ہے۔

اب کی بار تو گھنشیام سے نہیں رہا گیا۔ اُس نے ٹیکسی لی اور سیدھا ساوتری کے مکان کو روانہ ہو گیا۔

ہیریسن روڈ پر چترنجن بلاک کے جس فلیٹ میں ساوتری کا مکان تھا اُسے دیکھ کر گھنشیام کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ گندہ سا ایک کمرہ اور ایک رسوئی گھر کا فلیٹ۔ دروازے کے باہر ٹنگے ہوئے گندے سے کپڑے اِس بات کا مظاہرہ کر رہے تھے کہ ساوتری نہایت مفلسی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔

دروازہ کھٹکھٹانے پر جس نحیف سی آواز نے جواب دیا وہ ساوتری کی بھی ہو سکتی ہے ؟ یہ اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آیا تھا۔ لیکن جب اُس آواز کی شکل کواڑ کھول کر سامنے کھڑی ہو گئی تو وہ کانپ اٹھا۔

ساوتری نے کہا ــــــ "آئیے"

اُس کے چہرے پر پرانے مریضوں کی سی زردی چھائی ہوئی تھی۔ اُس کے لباس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بستر پر سے اٹھ کر آئی ہے اور اُس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ مصنوعی ہے اور اُس کے پس پردہ ذہنی کوفت اور مصیبتوں کی ایک طویل کہانی ہے۔

ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ ساوتری نے بجلی روشن کی تو ایک نگاہ سے کمرے کا جائزہ لے کر وہ ساوتری کی زندگی کی ساری کیفیت بھانپ گیا۔

گھنیشام کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے ساوتری نے پوچھا ــــــ "کب آئے یہاں ؟"

ساوتری چارپائی پر بیٹھنے میں تکلیف محسوس کر رہی تھی۔ گھنیشام یہ بھانپ گیا تھا۔ اِس لئے اُس نے کہا ــــ "تم بیمار معلوم ہو ! لیٹ جاؤ۔"

اور پھر دوسرے لمحے اُس کے نزدیک جا کر اُس کے ہاتھ اور پیشانی کو چھوتے ہوئے اُس نے کہا ــــ "بخار تو نہیں کمزوری معلوم ہوتی ہے۔ کس کا علاج کر رہی ہو۔ کب سے تکلیف ہے ؟"

ساوتری نے پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے کہا ــــ "مجھے تو کوئی خاص تکلیف نہیں یُونہی جی خراب ہو رہا تھا اِسلئے ــــــ"

گھنیشام نے ایک ٹھنڈا سانس لیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو نکل آئے۔ اُس نے کہا ــــ "میں سب جانتا ہوں۔ اس روز تم شرمندگی کے خیال سے کہے بغیر چپکے سے یہاں آگئیں تو مجھے سخت چوٹ لگی۔ اتنے دن نہ رات کو نیند آئی نہ دن کو چین۔ یہی سوچتا رہا کہ

"تو میں نے کون سی خطا کی ہے کہ تم مجھے سیوا کا سو بھاگیہ دینے کے لئے بھی تیار نہیں۔ ایک دن تم نے مجھے مرتے ہوئے بچا لیا تھا۔ آج میرا اتنا بھی حق نہیں کیا؟ —— وہ خود کو ضبط نہ کر سکا۔ اس کی آواز رُک گئی —— اپنے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے اُس نے کہا ——
"تم مجھ سے کتنی ہی دُور رہنے کی کوشش کیوں نہ کرو مگر یہ ناممکن ہے مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتا تم مصیبتوں کا شکار بنی رہو اور میں خاموش رہوں یہ ناممکن ہے۔"

ساوتری چارپائی سے اُٹھ پڑی۔ پاؤں پر کھڑے ہوتے ہوئے اُس نے کہا —
"چائے پیو گے یا کافی؟"

ساوتری بات کا رُخ بدلنا چاہتی تھی۔ گھنیشام یہ سمجھ گیا۔ اُس نے کہا —"تم اِس کے لئے کوئی تکلیف نہ کرو۔" اور پھر اُس کے جواب کا انتظار کئے بغیر اُس نے ساوتری کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر چارپائی پر بٹھاتے ہوئے کہا —" تم سے ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں تم میری ایک سیوا سویکار کرو۔"

"کہئے۔" ساوتری نے سنجیدگی سے کہا۔

"تو اکھلی چلی چلو۔ میں ذمّہ لیتا ہوں گوپی ناتھ بابو کو بُلانے کا —— تمہارا علاج بھی ہو جائے گا —" گھنیشام نے انکساری سے کہا۔

ساوتری خاموش رہی —— ایک لمحہ کے بعد اُس نے کہا —" کلکتہ چھوڑ کر تو اکھلی چلی جاؤں۔ یہ تو ہو نہیں سکتا اور اُن کے آنے کی بات —— وہ آج نہیں تو کل ضرور آ جائیں گے لیکن ——"

"یہ میں جانتا ہوں۔" گھنیشام نے کہا —" اُن کے آنے پر بھی تمہاری ذہنی کوفت کم نہیں ہو گی۔ یہی کہنا چاہتی ہو نا؟ لیکن مجھے وشواس ہے کہ دُنیا میں کوئی بات ناممکن نہیں۔ کون جانتا ہے پرماتما کی کیا مرضی ہے؟"

ساوتری کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اُس نے کہا —" کسی وقت مجھے بھی یہی خیال تھا لیکن اب تو پرماتما پر سے بھی وشواس اُٹھتا جا رہا ہے۔ تم کیا جانو میں نے اِتنے برسوں تک کتنی جدوجہد کی ہے لیکن جہاں ریت ہو وہاں پانی کہاں سے نکل آئے۔"

وہ بچّوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔ گھنشیام تذبذب میں پڑ گیا۔ یکایک اُس نے محسوس کیا کہ رونا رانا نہیں بلکہ پرانی بیماری ہے۔ ساوتری کا رونا بند نہیں ہوا تھا بلکہ وہ روتے روتے غش کھا کر گر پڑی تھی۔

گھنشیام کانپ اُٹھا۔ کانپتے ہاتھوں سے ساوتری کو اپنی گود میں رکھتے ہوئے اُس نے کہا۔ "آنکھیں کھولو۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے ——"

ساوتری کی آنکھیں بند تھیں۔ جبڑے جڑ گئے تھے۔ وہ اور بھی پریشان ہو گیا۔ اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُس نے پانی کا گلاس لے کر منہ پر چھینٹے مارے۔ ساوتری کو ہوش آنے لگا۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں —— اپنے آپ کو گھنشیام کی گود میں دیکھ کر اپنے لبوں پر پھیکی سی مُسکراہٹ لاتے ہوئے وہ اُٹھ کر چارپائی پر لیٹ گئی۔ ایک لمحہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ اس کے بعد گھنشیام نے اُس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا —— "جو کچھ بھی ہو اب میں یہ حالت برداشت نہیں کر سکتا۔ تمہیں میری درخواست ماننی ہی پڑے گی۔"

اور جب ڈاکٹر کو بلا کر اُس نے ساوتری کے نہ نہ کرتے ہوئے بھی انجکشن لگوا دیئے اور ڈاکٹر کو ہر روز آنے کے لئے کہہ دیا تو اُس نے محسوس کیا کہ ساوتری چاہے کچھ بھی محسوس کرے اُس کو اپنا فرض ادا کرنا ہی چاہیئے۔ اب کے اُس نے ساوتری سے پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ —— شیلندر بابو کے گھر کی مہری کو بُلا کر اُس نے کہا —— "یہ تمہاری خدمت کرے گی۔ میں صبح آجاؤں گا اور تمہیں ایک پل کے لئے بھی یہاں رہنے نہیں دوں گا۔"

ڈاکٹر نے کہا تھا کہ بیماری کی وجہ سے دِل کی کمزوری ہے۔ مریضہ کو کوئی فکر پریشان کر رہا ہے لیکن اگر اسے سیر و تفریح میں مصروف رکھا جائے تو تندرست ہو جائے گی۔

دوسرے دن ساوتری نے بہتیرا انکار کیا۔ بہت حُجت کی لیکن جذبات کی رَو میں بہہ جانے والے گھنشیام کے سامنے اُس کی ایک پیش نہ گئی۔ اُسے اُسی بلاک میں ایک بڑے فلیٹ میں منتقل ہونا پڑا۔ گھنشیام نے نوکر چاکر اور سامان کا بندوبست پہلے

ہی کرلیا تھا۔ ساوتری اِس حد تک گھنیشام کی مہربانیوں کا بوجھ برداشت کرنا نہیں چاہتی تھی لیکن گھنیشام کے اصرار کے سامنے اُس کی ایک نہ چلی۔ اُس فلیٹ میں منتقل ہونے کے بعد اُس شام گھنیشام نے مُسکرا کر کہا — "اب بتاؤ چائے ملے گی یا کافی؟"

ساوتری کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے — گھنیشام کے مزاج سے واقف تھی اور دو دِن کے واقعات سے جان گئی تھی کہ — بچپن میں جو نوجوان اِس قدر جذباتی واقع ہوا تھا کہ ذرا ذرا سی بات پر خودکشی کے لئے تیّار ہوجاتا تھا اب اتنے سال گزرنے کے بعد بھی اُس میں سنجیدگی نہیں آئی۔ جذبات کے دھارے میں بہہ جائے تو اُسے روکنا ناممکن ہوجاتا ہے۔

اُس نے کہا — "ایک بات پوچھوں گھنیشام بابو؟"

"پوچھو۔" گھنیشام نے حیرانی سے کہا۔

"اگر تم میرا ایک کام کرسکو تو میں تمہارے احسان کا بوجھ کبھی اُتار نہیں سکوں گی۔"

اُس نے سنجیدگی سے کہا — "کوئی ملازمت مِل سکتی ہے؟"

"کیسی — کِس کے لئے؟"

"میرے لئے۔" ساوتری نے کہا — "اگر مجھے کوئی ملازمت مِل جائے تو مجھے کوئی پریشانی نہیں رہے گی۔"

گھنیشام کھلکھلا پڑا۔ اُس نے کہا — "سچ مچ کرلوگی؟"

"ہاں۔"

"تو میں نواکھالی میں سکول کھولتا ہوں۔ تم وہاں اکیلی پڑھایا کرنا۔" گھنیشام نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

ساوتری خاموش رہی۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

گھنیشام کہنے لگا — "پگلی کہیں کی۔ میرے ہوتے ہوئے تمہیں ملازمت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

ساوتری نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا — "تم ابھی تک جذبات کی رَو میں

بہے جا رہے ہو گھنشیام بابو! تم نے مجھ پر بہت احسان کیا ہے۔ میں اس کا بدلہ کبھی چکا نہیں سکتی۔ لیکن دُنیا کو جانتے ہو دُنیا ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔"

گھنشیام نے زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ — "دُنیا جائے جہنم میں۔ جن کے دلوں میں صفائی ہو دُنیا اُن کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔"

اور پھر اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے اُس نے کہا۔ — "ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ تم بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی۔"

نوکر کافی تیار کر کے لایا تھا۔ ساوتری نے ہی میزبانی کا فرض انجام دیا۔

اور جب دونوں کافی سے فارغ ہوئے تو گھنشیام نے کہا۔ — "دیکھو مجھے شیلندر بابو کے ہاں جانا ہے اور پھر شاید ایک دو روز میں نو کھلی واپس جانا پڑے۔ جب تک واپس نہیں آتا تا کوئی اور ڈرامہ کھیل نہ دینا۔"

تاہم اُسے شک تھا۔ اِس خیال سے کہ کہیں ساوتری نوکروں چاکروں کو برخاست کر کے پھر پرانے ڈبے میں ہی نہ چلی جائے، وہ رات کو واپس آ گیا۔ ساوتری نے اُسے دیکھ کو حیرانی سے پوچھا — "تم نو کھلی نہیں گئے کیا؟"

"خیال تو تھا مگر اب نہیں۔" گھنشیام نے مسکراتے ہوئے کہا — "بات یہ ہے کہ مجھے تم سے ڈر لگتا ہے۔ اِس لئے خود جانے کی بجائے کملیش کو ہی یہاں بُلا لینے کا ارادہ ہے۔ دونوں کا جی بہل جائے گا۔"

اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر اُس نے کہا — "کیوں تمہارا کیا خیال ہے؟"

ساوتری نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اُس کے مسکرانے سے اُس نے بھانپ لیا کہ ساوتری کو کوئی اعتراض نہیں۔ شاید اُس کی مسکراہٹ کا یہ مطلب تھا کہ — تم نے جو فیصلہ کر لیا ہے اُس سے مل جانا تمہارے لئے تو واقعی ناممکن ہے۔

دُوسرے دن گھنشیام ساوتری کی ہچکچاہٹ کے باوجود اُسے سینما لے گیا۔

سینما سے واپسی پر گھنشیام شیلندر بابو کے گھر نہیں گیا بلکہ روز کی طرح ساوتری کے فلیٹ پر ہی ٹھہر گیا۔

ساوتری کھانا بنانے میں مہری کی مدد کر رہی تھی اور گھنشیام ایک کمرے میں بیٹھا ہوا گزشتہ دو دن کے واقعات پر سوچ رہا تھا۔ "عجیب ہے یہ زندگی"۔ اُس نے دل ہی دل میں کہا۔ برسوں کے بعد ساوتری سے اُس کی ملاقات ہوئی تھی۔ اُس کے دل میں جانے کیا کیا خیالات پیدا ہو رہے تھے اور ساوتری کیا سوچ رہی ہوگی یہ کہنا مشکل ہے کہ گھنشیام محض ہمدردی کے جذبہ سے متاثر ہو رہا تھا اور اُس کے دل پر ماضی کے واقعات اثر انداز نہیں ہو رہے تھے — لیکن کیا ساوتری کے دل کی کیفیت بھی یہی تھی۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اُس نے ساوتری سے کہا — "ایک بات پوچھوں بتاؤ گی؟"

"فرمائیے"

گھنشیام جو کچھ کہنا چاہتا تھا۔ پہلے تو کہہ نہ سکا۔ پھر اُس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا — "اتنے دنوں کبھی تمہیں میرا خیال آیا؟"

ساوتری خاموش رہی۔

گھنشیام نے کہا — "بات دراصل یہ ہے کہ نینی تال سے مجھے اچانک ہی بھاگنا پڑا تھا۔ راے بہادر کے تیوروں سے مجھے خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ ہم دونوں پر کوئی مصیبت آجائے گی۔

تمہارے خیال سے نینی تال سے غائب ہو جانے کا فیصلہ کیا تھا لیکن بدقسمتی سے اُلٹا مصیبت میں پھنس گیا۔ اُس کے بعد جو کچھ ہوا تم جانتی ہو۔ تمہیں منہ دکھانے کی ہمت ہی نہیں ہوئی لیکن تم نے بھی تو مجھے یاد نہیں کیا۔ اپنے دل سے فراموش کر دیا۔"

"دل سے فراموش کون کر سکتا ہے گھنشیام بابو" ساوتری نے سنجیدگی سے کہا "مجھے تو صحیح حالات کا علم ہی نہیں تھا اور اگر ہوتا بھی تو تم جانتے ہو کہ ایک بے کس لڑکی کیا کر سکتی ہے؟"

"یہ میں جانتا ہوں اور میرے لئے یہی سب کچھ ہے ساوتری" گھنشیام نے

اپنی کرسی نزدیک لاتے ہوئے کہا ـــ "اس روز تم بے خبری میں نواکھلی آگئیں تو میں کچھ کہنے کی ہمت نہیں کر سکا لیکن تم بھی تو خاموش رہیں۔ دِل کھولنے کا موقع ملا تھا۔ لیکن تم اچانک ہی غائب ہوگئیں"

ساوتری مسکرادی۔

گھنیشام کہتا گیا ـــ "میں کتنا پریشان ہوا، کتنا مضطرب ہوا۔ اتنی راتوں کو نیند تک نہ آئی معلوم نہیں تم اتنی سنگ دِل کیوں ہوگئیں"

"سنگ دِل کی بات نہیں" ساوتری نے ہلکی آواز میں کہا ـــ "اگر تم میں ہمدردی کا جذبہ ہے تو میرا دِل بھی پتھر نہیں۔ کوئی اپنے دِل کی بات کھول کر کہہ سکتا ہے۔ لیکن دوسرے کے لئے مشکل بھی ہو سکتا ہے"

"یہ میں مانتا ہوں" گھنیشام نے کہا ـــ "لیکن یقین کرو کہ دنیا بدل جائے، مگر گھنیشام کے لئے بدل جانا ممکن نہیں"

اور ایک لمحہ رک کر اُس نے کہا ـــ "مجھ سے زیادہ تمہاری ذہنی کوفت کا کوئی دوسرا اندازہ نہیں کر سکتا۔ اگر میرے بس کی بات ہو تو...."

"یہی تو ناممکن ہے گھنیشام بابو" ساوتری نے سنجیدگی سے کہا ـــ "انسان کی زندگی میں اکثر ایسے مرحلے آتے ہیں جب جیون کی گتھیوں کو سُلجھانا ناممکن ہو جاتا ہے"

بات معنی خیز تھی۔ گھنیشام نے ایک لمحہ خاموش رہ کر کہا ـــ "مجھے اِس سے اتفاق نہیں۔ دُنیا میں کوئی بات مُشکل تو ہو سکتی ہے مگر ناممکن نہیں۔ سماج کے جو بندھن زندگی کو پریشان کن بنا دیتے ہیں اُنہیں توڑ دینا ہی بہتر ہے"

"کہنا آسان ہے اور یہ بھی درست ہے کہ جذبات کے بہاؤ میں ہر انسان بہہ جاتا ہے اور اگرچہ آدمی سمجھنے کے باوجود عمل کرنے کی جُرأت نہیں کر سکتا لیکن کئی لوگ جرأت بھی کر لیتے ہیں لیکن میں سوچتی ہوں کہ اگر ہم بندھن کو اِس طرح توڑتے جائیں تو سماج کی کیا حالت ہوگی زندگی کا کیا انجام ہوگا"

ساوتری نے بات پتے کی کہی تھی گھنیشام سوچنے لگا کہ کیا جواب دے اور پھر اُس

نے کرسی سے اُٹھ کر ٹہلتے ہوئے کہا ــــ "یہ فلسفے دانوں کی باتیں ہیں۔ بڑے بڑے لیڈروں کی باتیں ہیں۔ لیکن اُن لوگوں کی ذاتی زندگی کو دیکھا جائے تو اُس میں کوئی مناسبت نظر نہیں آئے گی۔"

"یہ میں مانتی ہوں۔" ساوتری نے سنجیدگی سے کہا ــــ "لیکن زندگی کے دوزخ ہونے کے باوجود فلسفہ دانوں اور لیڈروں کو سماج کے قواعد کا خیال رکھنا پڑتا ہے چاہے وہ نمائش ہی کیوں نہ ہوں۔"

گھنشیام ساوتری کے پیچھے کھڑا ہو گیا تھا۔ اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اُس نے کہا ــــ "یہی نمائش تو زندگیوں کو تلخ بنا دیتی ہے۔ اگر اِس سے گھرانے تباہ ہو جائیں تو کیا یہ اچھی بات ہے؟"

"ہاں!" ساوتری نے کہا ــــ "بعض اوقات ایک کی بھلائی کے لئے دُوسرے کو اپنی ذہنی کوفت برداشت ہی کرنی چاہیئے۔"

گھنشیام کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ ساوتری نے اُسے خاموش دیکھ کر کہا ــــ "ایک بات پوچھوں ــــ بتاؤ گے؟"

"کہو۔"

"کملیش تمہیں محبت کرتی ہے؟"

"بے حد! اُس کے لئے میں ہی اُس کی زندگی کا ایک سہارا ہوں۔"

"اور تمہیں ــــ؟"

"مجھے اُس سے کوئی شکایت نہیں۔"

"محبت بھی ہے؟"

"خیال تو ایسا ہی ہے۔"

"خیر۔" ساوتری نے کہا ــــ "کیا تم اُسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ سکتے ہو؟"

گھنشیام تذبذب میں پڑ گیا۔

ساوتری مُسکراتے ہوئے اُس کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

گھنیشام کرسی پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا ــــ "بات یہ ہے کہ اُسے چھوڑ دینا ناممکن ہے۔ آخر میرے سوا اُس کا کون ہے۔ اِس سے تو اُس کی زندگی برباد ہو جائے گی۔"

سادھتری کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اُس نے کہا ــــ "یہی تو میں کہتی ہوں گھنیشام بابو! زندگی کی بعض گتھیاں سلجھانا ناممکن ہوتا ہے۔ ہر بات میں ایک ہی دلیل کام نہیں دیتی۔"

گھنیشام لاجواب ہو گیا۔ اُسے سخت چوٹ لگی تھی۔ اُس نے کہا ــــ "خیر میں تمہارے معاملوں میں دخل دینا نہیں چاہتا۔ تمہارا نظریہ اور ہے مگر میں تو جذباتی آدمی ہوں مجھ سے کسی کا دُکھ دیکھا نہیں جاتا۔ اِسی لئے تمہیں اِس حالت میں دیکھتا ہوں تو پریشان ہو جاتا ہوں۔"

باتیں کرتے کرتے دیر ہو گئی تھی۔ سادھتری نے مہری کو بُلایا تھا لیکن غالباً وہ دن بھر کام کرنے سے تھک کر سو گئی تھی۔

گھنیشام دُوسرے کمرے میں جانے والا تھا۔ اُس نے سادھتری کو پریشان دیکھ کر پوچھا ــــ "کیوں کیا معاملہ ہے کسی چیز کی ضرورت ہے کیا؟"

"نہیں ــــ کسی چیز کی ضرورت نہیں۔" سادھتری نے مُسکراتے ہوئے کہا ــــ "بات یہ تھی کہ سر میں درد ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا۔ مہری آجائے تو مالش کرالوں۔"

گھنیشام خاموش ہو گیا ــــ اِس کے بعد اُس نے کہا ــــ "تم بستر پر لیٹو۔ میں مالش کر دیتا ہوں۔"

"نہیں۔ کوئی خاص ضرورت نہیں۔" سادھتری نے بیزدگی سے کہا۔

"خواہ مخواہ پریشان ہونے کی کیا ضرورت؛ گھنیشام نے کہا اور پھر اُس نے سادھتری کو بازو سے پکڑ کر اُسے پلنگ پر لٹاتے ہوئے کہا ــــ "معلوم ہوتا ہے تمہیں مجھ سے ڈر لگتا ہے لیکن میں کہتا ہوں جس دِن تم گھنیشام پر شک کرنے لگو گی اُس دِن گھنیشام اِس دُنیا میں نہیں رہے گا۔"

"عجیب آدمی ہو۔" سادھتری نے مصنوعی ہنسی ہنستے ہوئے کہا ــــ "تم پر شک کروں یہ بھی کبھی ہو سکتا ہے۔"

درحقیقت وہ گھنشیام کی باتیں سن کر کانپ اٹھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ گھنشیام بھلے ہی شریف ہو اور وہ گزشتہ زندگی کی باتوں کو حال اور مستقبل سے وابستہ کرنا نہ چاہتا ہو لیکن اس کے اندر جو جذباتی انسان چھپا ہوا ہے اس سے اسے ڈرنا ہی چاہیئے اسلئے وہ اپنا خوف چھپاتے ہوئے پھیکی ہنسی ہنس رہی تھی۔ انکار کرنا بھی مشکل تھا کیونکہ گھنشیام جیسے جذباتی آدمی سے یہ بھی اندیشہ ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی اور ڈرامہ کھیل کر کوئی نئی مصیبت کھڑی کر سکتا ہے۔

گھنشیام مالش کر رہا تھا لیکن اس کے دل میں جذبات کا جو طوفان اٹھ رہا تھا، اسے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے بھی وہ روک نہ سکا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے نکلے اور ساوتری کے منہ پر گر پڑے۔

ساوتری جانے کیا سوچ رہی تھی۔ آنسوؤں کے قطرے گرتے ہی چونک پڑی۔ اس نے کہا۔ "جاؤ گھنشیام بابو! اب مجھے کوئی درد نہیں۔ تم سو جاؤ اپنے کمرے میں رات زیادہ ہو رہی ہے۔"

گھنشیام اٹھا اور آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

ساوتری نے چاہے کچھ ہی سمجھا ہو۔ چاہے وہ ساری رات غور و فکر کے سمندر میں ڈوبی رہی ہو۔ لیکن گھنشیام بابو کو بھی ساری رات نیند نہیں آئی۔ اپنے کمرے میں آنے سے چند لمحے پہلے نہ جانے وہ کیوں ایک گدگدی سی محسوس کر رہا تھا۔ جانے کیوں خوش ہو رہا تھا۔ کمرے میں واپس آیا تو اس گدگدی کے ساتھ ہی بے چینی بھی پیدا ہونے لگی۔ بستر پر لیٹتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں کہا اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟

اس کے دماغ میں زندگی کے تمام گزشتہ واقعات ایک ایک کر کے آنے لگے۔ سوتیلی ماں کا سلوک۔ نینی تال جانا۔ ساوتری سے پہلی ملاقات۔ ہمدردی، انس اور محبت۔ مستقبل کے سنہرے وعدے اور حسین تصور۔

وہ ساوتری سے آج یہ کہہ چکا تھا کہ جس دن وہ اس سے ڈرے گی اس دن گھنشیام اس دنیا میں نہیں رہے گا لیکن اس کا ضمیر کہہ رہا تھا کہ یہ بات درست نہیں

اس نے اپنی بیوی کو یقین دلایا تھا کہ اُس کے سوا اُسے کسی دُوسرے سے محبّت نہیں۔ لیکن آج جذبات کے بہاؤ میں اُسے یہ بھی غلط معلوم ہو رہا تھا۔ اُس نے دِل ہی دِل میں کہا — میری محبّت کا مرکز اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ ساوتری ہی ہے۔ اُس کے سوا مجھے کسی دُوسرے سے محبّت نہیں۔

وہ بے چین ہو اُٹھا۔ اُس نے دِل ہی دِل میں کہا — میں جو چاہتا ہوں جو میرا دِل کہتا ہے وہ ہو کر ہی رہے گا۔ آج نہیں تو کل۔ ساوتری میرے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔

اور پھر اُس نے سوچا — ساوتری کو گوپی ناتھ بابو کے متعلق چاہے کچھ بھی خیال ہو لیکن وہ اُس سے تنگ ہے۔ اُس سے دِلی محبّت نہیں کرتی۔ محض سماج کے خوف سے ہچکچا رہی ہے۔

اور پھر اُسے ساوتری سے ہمدردی ہونے لگی۔ اُس نے سکیمیں بنانا شروع کر دیں وہ ساوتری کو اس ذہنی کوفت سے ضرور نجات دلائے گا چاہے اُسے اُس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی بھی کیوں نہ دینی پڑے۔

انسان بھی ایک عجیب و غریب جاندار ہے۔ ایک گھرانہ کو برقرار رکھنے کے لئے ایک وقت اصُولوں اور قاعدوں کی دیواریں کھڑی کرتا ہے اُن دیواروں کو قائم رکھنے کے لئے لمبے چوڑے دعوے کرتا ہے۔ وعدا دیتا ہے اور شرافت کا جامہ اوڑھ لیتا ہے۔ لیکن اُن دیواروں کو توڑنے کے درپے بھی رہتا ہے اور جب کوئی دوسرا راستہ دکھائی نہ دے تو اُس کے جذبات ہمدردی اور جنون کی شکل اختیار کر کے اُس کے کردار پر چھا جاتے ہیں۔ اور وہ اپنی ہی کھڑی کی ہوئی دیواروں کو توڑنے کے لئے اصلاح کا علمبردار بن کے سامنے آجاتا ہے۔

گھنشیام بھی اب سدھارک کا رُوپ اختیار کر رہا تھا۔ جنون اُس کے دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ اگر کوئی غیبی طاقت اُسے اچانک روک نہ دیتی تو وہ رات کے گھُپ اندھیرے میں ساوتری کے کمرے میں داخل ہو جاتا۔ اپنے آنسوؤں سے اُس کے

پاؤں دھو دیتا اور اپنا دل کھول کر رکھ دیتا۔ اُسے یقین تھا کہ اِس طرح سے ساوتری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے گی۔ وہ سارے سنسار کو چھوڑ کر اُس کے ساتھ چلنے کو تیار ہو جائے گی۔

اور پھر اُس نے کتنے ہی نقشے بنائے، کتنے ہی حسین تصور اُس کے دماغ میں آئے کس طرح سے وہ کملیش کو تاریکی میں رکھے گا، کس طرح وہ ساوتری کے ساتھ کراچی میں سمندر کے کنارے چہل قدمی کرے گا۔ وہ کتنی حسین نظر آئے گی اور دونوں کی زندگی کس قدر مسرت انگیز ہو گی۔

نہ جانے کب نیند آگئی اور کب وہ اپنی تمام تمناؤں اور اُمنگوں کو لئے ہوئے سو گیا۔

بارھواں باب

ایک دن اور گزر گیا۔ جنون نے اُس کے چہرے کی رنگت تبدیل کر دی تھی۔ شام کو سیر سے واپس آتے ہوئے گھنشیام باغ سے گلاب کا ایک پھول توڑ کر لایا تھا۔ رات میں اُس نے یہ پھول ساوتری کو دیا تو اُس نے عذر نہیں کیا لیکن گھر لوٹ کر جب اُس نے دیکھا کہ ساوتری نے اُسے اپنی تصویر یا ساڑھی کی زینت بنانے کی بجائے توڑ کر پھینک دیا ہے تو گھنشیام کے دل کو سخت چوٹ لگی۔

ایک چوٹ اُسے اِس سے پہلے بھی لگی تھی۔ سیر کو جاتے ہوئے بازار میں رُک کر گھنشیام نے ساوتری کو کہا تھا — "ذرا ٹھہرو تو دکان سے کپڑا خرید لیں"۔

"کیا ارادہ ہے خریدنے کا؟" ساوتری نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

"جو تم پسند کرو"۔ گھنشیام نے کہا تھا۔ "میرا خیال ہے کہ تم ایک دو ساڑھیاں خرید لو"۔

"مجھے اُن کی ضرورت نہیں" — ساوتری نے سنجیدگی سے کہا تھا اور پھر گھنشیام کے اصرار کرنے کے باوجود وہ موٹر سے باہر نہیں نکلی تھی۔ گھنشیام اُس کے رُوکھے پن سے بہت اُداس ہوا تھا اور جب اُس نے گھر لوٹ کر اِتنا کچھ ہو جانے پر بھی ساوتری کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی تو وہ جل گیا۔

ساوتری نوکر کو چائے لانے کے لئے کہہ کر دوسرے کمرے میں کپڑے بدلنے کے لئے

چلی گئی تھی۔ نوکر چائے لایا تو گھنیشام نے جو پہلے ہی جلا بھنا بیٹھا تھا، کہا ——"کیا ہے؟"

"چائے! بی بی جی نے تیار کرنے کے لئے کہا تھا۔"

"مجھے چائے کی ضرورت نہیں" گھنیشام نے غصّے کے لہجے میں کہا ——"جنہوں نے تیار کرائی ہے اُنہی کے پاس لے جاؤ!"

"کیا جھگڑا ہو رہا ہے؟" ساوتری نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ اُس کے چہرے پر اب بھی مُسکراہٹ تھی۔

گھنیشام یہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا کہ "مجھے سر درد ہے۔ چائے کی ضرورت نہیں"

ساوتری ہکی بکی رہ گئی۔ ایک لمحہ خاموش رہ کر اُس نے کہا ——"اسپرین منگوا دوں؟"

"نہیں"

"تو مالش کر دیتی ہوں"

"مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں" یہ کہتے ہوئے گھنیشام دوسرے کمرے سے باہر نکل گیا۔

ساوتری رسوئی گھر میں داخل ہو گئی —— گھی کی کٹوری لے کر گھنیشام کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اُس نے کہا ——"تم کوچ پر بیٹھ جاؤ۔ میں مالش کرتی ہوں" یہ کہہ کر اُس نے مُسکراتے ہوئے اُس کے قریب جا کر کہا ——"بیٹھو تو سہی۔ مجھ سے ڈر لگتا ہے تو اور بات ہے ورنہ ....." اب کے ساوتری مُسکرائی تو گھنیشام کا غصّہ بھی دُور ہو گیا۔

ساوتری اُس کے سر کی مالش کر رہی تھی اور گھنیشام خاموشی سے بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ آج اُسے محض غلط فہمی ہوئی تھی ورنہ ساوتری کے برتاؤ کے طریقے میں تو کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

ساوتری جانے کیا سوچ رہی تھی۔ آج بھی اُس کے دِل میں گھنیشام سے خوف کا جذبہ موجود تھا یا نہیں یہ تو وہی جانے لیکن گھنیشام اپنے اندر پھر ایک گدگدی سی محسوس کر رہا تھا —— جس کی محبّت نے اُسے برسوں سے پاگل کر دیا تھا آج وہی اُس

کے قریب کھڑی تھی۔ اُس کی سانس تک اُسے محسوس ہو رہی تھی۔ ایک دن پہلے اُس کے دل میں جذبات کی جو آگ بھڑکی تھی وہ آج پھر روشن ہو رہی تھی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا گویا وہ دریا کے کنارے پر کھڑا ہے اور کنارے پھیل رہے ہیں۔

ساوتری نے کہا — "تم آج اُداس اُداس کیوں نظر آتے ہو۔ بھابی صاحبہ تو یاد نہیں آ رہیں؟"

گھنشیام خاموش رہا۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ساوتری نے پھر کہا — "اب تمہارے درد کا کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہے"۔ گھنشیام نے اُسے بازو سے پکڑ کر سامنے بٹھاتے ہوئے کہا — "تمہاری باتوں نے ہی آج پریشان کیا تھا ورنہ —"

"سر درد کی شکایت کوئی نہیں تھی"۔ ساوتری نے مسکراتے ہوئے کہا — "تو چائے پیو گے نا؟"

یہ کہتے ہوئے اُس نے نوکر کو چائے لانے کے لئے آواز دی۔

چائے نوشی کرتے ہوئے ساوتری نے کہا — "ذرا ذرا سی بات سے ناراض نہیں ہونا چاہیئے گھنشیام بابو! آخر مجھے بھی تو دیکھتے ہو کس طرح مصیبتوں کا مقابلہ کر رہی ہوں۔ اگر میری جگہ تم ہوتے تو —"

"گویا مجھے کوئی دُکھ نہیں"۔ گھنشیام نے سنجیدگی سے کہا — "تم سمجھتی ہو کہ میں بالکل سُکھی ہوں"

"تمہیں کس بات کا دُکھ ہے گھنشیام بابو؟" ساوتری نے حیرانی سے پوچھا۔

"تمہیں معلوم نہیں"

"نہیں"

گھنشیام نے اُٹھ کر اُسے دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا اور اُسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے چھاتی سے لگاتے ہوئے کہا — "تمہیں معلوم ہی نہیں۔ تم جانتی ہی نہیں مجھے برباد کر کے معصوم بنتی جا رہی ہو؟"

ساوتری اُس کے پاگل پن کو دیکھ کر کانپ اٹھی۔ زور سے جھٹکا دے کر اُس نے اپنے آپ کو گھنشیام کی گرفت سے چھڑا لیا۔ اُس نے چلّا کر کہا ــــ "کیا ہو رہا ہے آپ کو گھنشیام بابو!"

نوکروں کو پتہ نہ لگ جائے اِس خوف سے اُس نے جھگڑنے کی کوشش نہ کی اور نہ ہی زور سے آواز بلند کی تھی۔ گھنشیام کے تصوّرات کا محل ایک ہی ضرب سے گر کر چکنا چور ہو گیا تھا اور وہ بُت کی طرح خاموش کھڑا تھا۔

ساوتری حیران اور پریشان کھڑی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگی۔ اُس نے روتے ہوئے کہا ــــ "یہی تمہاری ہمدردی ہے۔ یہی تمہارا پیار ہے۔ میں ابلا ہوں۔ اِسی لئے تو..... اِسی لئے تو..... مجھے توڑ ڈالو۔ ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔ میری قسمت میں یہی لکھا ہے....."

گھنشیام خوف سے کانپنے لگا۔ وہ ابھی تک خاموش کھڑا تھا۔ ساوتری کی زبان سے یہ الفاظ سُن کر اُس کا سر چکرا اٹھا۔ "اُف!" کہہ کر وہ دھڑام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔

دوسرے لمحے سر جھکائے ہوئے اُس نے خاموشی سے کہنا شروع کیا ــــ "میں پاگل ہو گیا تھا ساوتری! مجھے معاف کر دو! میرے جذبات نے مجھے دیوانہ بنا دیا تھا۔ مجھے محبت کے رشتے کے مقدّس بندھنوں کا احساس نہیں رہا تھا۔ اغراض کے نشے نے مجھے اندھا بنا دیا تھا۔ آئندہ ایسی غلطی کبھی نہ ہو گی۔"

اور پھر اپنی جگہ سے اُٹھ کر ساوتری کے قریب جا کر دونوں ہاتھ جوڑ کر اُس نے کہا ــــ "مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہیں بہت ستایا ہے۔ بہت پریشان کیا ہے۔"

ساوتری کی آنکھوں سے اب بھی آنسو بہہ رہے تھے۔ اُس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا ــــ "میں بہت مظلوم ہوں۔ پتاجی کے بعد اب میرا کوئی سہارا نہیں رہا میں اناتھ ہو چکی ہوں۔"

گھنشیام کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے۔ اُس نے کہا ــــ "غلطی ہو چکی ہے۔ معاف کر دو۔ پرماتما کی سوگند کھا کر کہتا ہوں کہ آج سے تم میری بہن ہو۔ میں نے

تم سے ہمدردی کی تھی۔ مگر دل کا چور ختم نہ کر سکا۔ لیکن آج وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے جسم تک کو نہیں چھوؤں گا۔ تمہارے سامنے آنے کی کوشش بھی نہیں کروں گا۔"

ساوتری نے آنسو پونچھتے ہوئے اُس کے پاؤں کی دھول اپنے ماتھے پر لگاتے ہوئے کہا۔ "ترلوکی ناتھ سے پرارتھنا کرتی ہوں کہ تم ہمیشہ سُکھی رہو۔ بھائی کے سُکھی ہوتے مجھے بھی کوئی دُکھ نہیں ہوگا۔ میرا یہ بن باس کتنا بھی طویل کیوں نہ ہو، تمہاری آشیرواد سے کٹ جائے گا۔"

ساوتری کمرے سے باہر نکلی تو گھنشیام ایک بے جان لاشے کی طرح پلنگ پر گر پڑا۔

محبت کا نیا زاویۂ نگاہ چاہے اُس نے زندگی کی ایک نئی ٹھوکر سے مجبور ہو کر اختیار کیا ہو لیکن کتنی پاکیزگی تھی اِس میں اور اِس پاکیزہ ماحول میں ساوتری کا چہرہ کتنا حسین نظر آیا تھا اُسے۔

وہ اپنے کمرے میں تن تنہا پڑا بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

دوسری طرف دوسرے کمرے میں کواڑ بند کئے ہوئے ایک نوجوان حسین عورت اُسی کی طرح پلنگ پر پڑی ہوئی آنسو بہا رہی تھی۔ چند سال پہلے وہ ایک دولتمند گھرانے میں ناز و نعمت سے پلی ہوئی ایک لاڈلی لڑکی تھی۔ ہر کوئی اُس سے محبت کرتا تھا۔ وہ جو چاہتی اُسے پورا کر دیا جاتا۔ کسی کو اُس کی طرف آنکھ اٹھانے کی جرأت نہیں تھی۔ لیکن آج تو بالکل یتیم تھی۔ بالکل لاوارث۔ اُس کا خاوند اُسے چھوڑ کر غائب ہو گیا تھا اور جو اُس سے ہمدردی کرنے آیا تھا وہی اُسے گدھ کی طرح نوچ ڈالنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

ایک گہری سانس لے کر اُس نے دل ہی دل میں کہا — پرماتما تو مجھے اپنے پاس کیوں نہیں بلا لیتا۔ کیا میرے پچھلے جنم کے گناہوں کا ابھی تک کفارہ نہیں ہوا۔ کیا مجھے ہمیشہ نرک کنڈ میں جلنا پڑے گا۔

تیرھواں باب

اُس روز کا واقعہ ساوتری بھول گئی تھی یا نہیں یہ کہنا مشکل ہے لیکن گھنیشام اِتنے دِن گزر جانے کے باوجود بھی جب کبھی سوچتا دل ہی دِل میں شرمندہ ہوتا اور اُسے یاد آجاتا وہ منظر جب وہ جذبات سے مغلوب ہوکر ساوتری کو جھنجھوڑ کر کہہ رہا تھا۔ "تمہیں معلوم ہی نہیں؟ تم جانتی ہی نہیں؟ مجھے برباد کر کے معصوم بنتی جا رہی ہو۔"

وہ سوچتا —— اگر وہ شور مچا دیتی تو —— کیا اِس سے وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل رہ جاتا اور پھر وہ سوچتا —— اُس حالت میں ساوتری کی اپنی کیا حالت ہوتی۔ کیا لوگ اُس پر اُنگلیاں نہ اُٹھاتے —— اور کیا وہ اِسے برداشت کر سکتا کیا وہ اِس صدمے سے پاگل نہ ہو جاتا۔

اُس روز ساوتری کے دُوسرے کمرے میں چلے جانے کے بعد وہ خوب رویا اور پھر کافی سوچ و بچار کے بعد اُس نے فیصلہ کیا تھا کہ اُسے دوبارہ ساوتری کے سامنے نہیں آنا چاہیئے۔ اِسی خیال سے ساوتری کے نام ایک خط چھوڑ کر وہ اچانک غائب ہو گیا تھا۔ تاہم جاتے وقت اِس اندیشہ سے کہ ساوتری کوئی خطرناک کھیل نہ کھیل دے اُس نے نوکر کو بُلا کر کہہ دیا تھا کہ وہ ایک ضروری کام پر جا رہا ہے ساوتری کو اُس کی غیر حاضری میں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونی چاہیئے۔ یہی نہیں بلکہ وہ ڈاکٹر کو بھی ضروری ہدایت کر آیا تھا کہ وہ گاہے گاہے ساوتری کو دیکھ آیا کرے۔

یہ نہیں کہ اُس نے گھر لوٹ آنے پر کملیش کو سارا واقعہ بتا دیا ہو۔ بے عزتی کے اندیشہ سے اُس نے اتنا ہی بتایا تھا کہ ساوتری کی طبیعت بہت خراب ہے۔ اُس کا خاوند اُسے چھوڑ گیا ہے اور اب وہ بھائی کی حیثیت سے اُس کی مدد کر رہا ہے۔

کملیش نے خاوند کی یہ حرکت پسند کی یا نہیں یہ گھنشیام کو معلوم نہیں ہو سکا تاہم کملیش نے بظاہر کوئی نکتہ چینی نہیں کی تھی بلکہ ایک مرتبہ تو اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر اُسے کلکتہ جانے کا موقع ملا تو وہ ساوتری سے ضرور ملاقات کرے گی۔ کچھ دن پہلے وہ ساوتری کا ذکر آنے پر خاوند کی دُکھتی رگ چھیڑ دیتی تھی۔ لیکن اب وہ عام طور پر خاموش ہی رہتی تھی ——— یہ نہیں کہ ساوتری کا ذکر اُس کی پہل سے شروع ہوتا ہو۔ لیکن وہ گھنشیام کے ارادوں میں رکاوٹ ڈالنے کی چنداں کوشش نہیں کرتی تھی۔

گھنشیام کلکتہ سے لوٹتے وقت ساوتری کے کمرے میں جو خط اور چیک چھوڑ آیا تھا ساوتری نے انہیں دیکھ لیا تھا اور دوسرے یا تیسرے دن گھنشیام کو اُس کی طرف سے جواب بھی موصول ہو گیا تھا۔ اُس نے لکھا تھا۔

بڑے بھائی!

پرنام ——— تم اُس روز اچانک غائب ہو گئے۔ اِس سے مجھے دُکھ ہوا۔ مجھے تمہارے دِل کی کیفیت کا بخوبی احساس ہے۔ لیکن آج بھی اگر تم ذرا بھی دُکھی ہو تو اِس سے مجھے زیادہ کسی اور کو دُکھ نہیں ہو گا ——— تم نے مجھ سے بہت ہمدردی کی ہے۔ میری بہت مدد کی ہے۔ سچ ہے کہ جیون کے اِس گھور اندھیارے میں تم ہی روشنی کی ایک کرن ہو۔ اگر تم بھی ناراض ہو گئے تو اِس سنسار میں میرا کوئی نہیں رہے گا۔

کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ اِس دُکھ بھرے جیون کا کب انت ہو گا۔ کب تک مصیبتوں کی آگ میں جلتی رہوں گی۔ لیکن کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ کچھ نہیں سوجھتا۔ یوں لگتا ہے گویا گھپ اندھیارا ہو اور میں اُس میں بھٹک رہی ہوں۔

میری ایک ہی پرارتھنا ہے کہ تم میرے لئے دُکھی نہ ہو۔ مجھے کچھ بھی نہیں چاہیئے۔ آج نہیں تو کل میں کوئی چھوٹی موٹی ملازمت ڈھونڈ لوں گی اور جسم اور رُوح کا تعلق

برقرار رکھنے کے لئے کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔ لیکن اگر تمہیں واقعی مجھ سے ہمدردی ہے اور تم میری مدد کرنا چاہتے ہو تو کسی طرح اُن کا پتہ ٹھکانہ معلوم کرو تاکہ میں اُن کے پاس پہنچ سکوں۔ مجھے اِس سے شانتی ملے گی۔ بدنصیب بہن

ساوتری

گھنشیام نے بار بار یہ خط پڑھا تھا۔ کملیش کو دکھایا تو اُس نے کہا ــــ "یہی ٹھیک ہے۔ تم اُس کی ملازمت کے لئے کوئی انتظام کر دو اور اُس کے پتی کا پتہ ٹھکانہ معلوم کرو۔ اِس سے بڑھ کر اور کوئی امداد نہیں ہو سکتی۔"

گھنشیام اُسی اُدھیڑ بن میں مصروف تھا۔ ایک مرتبہ اُس نے سوچا کہ کیوں نہ نوا کھلی میں ہی اپنے مزارعوں کے بچوں کے لئے ایک سکول کھول دے اور ساوتری کو اُس کا انتظام سپرد کر دے۔ لیکن دوسرے لمحے اُس نے سوچا کہ اُسے ساوتری کو اپنے نزدیک کبھی نہ رکھنا چاہیئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ اُسے بہن سمجھتا ہے اور ساوتری اُسے اپنا بھائی۔ لیکن انسانی فطرت کی کمزوری کا کیا پتہ۔ کیا معلوم کب جذبات غالب آجائیں ــــ اور پھر!

گھنشیام نے دو تین روز بعد اِس خط کا جواب دیا تھا۔ کملیش نے بھی ایک خط لکھا تھا لیکن کئی دن گذر جانے کے باوجود ایک خط کا جواب بھی نہ آیا۔

اس کے بعد اُس نے یکے بعد دیگرے کتنے ہی خط بھیجے لیکن جواب کی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ وہ پریشان سا ہو گیا۔ اُس نے سوچا وہ وسیع ذرائع ہونے کے باوجود اُس کے لئے ملازمت کا انتظام نہیں کر سکا۔ شاید اِسی لئے ساوتری نے کوئی جواب نہ دیا نہ ہو۔ ناراض ہو گئی ہو شاید اِسی وجہ سے!

لیکن ایک دِن جب ایک ساتھ اُس کے تینوں خط واپس آگئے اور اُن پر ڈاک کے ہرکارے کے یہ الفاظ پڑھے گئے کہ اِس نام کی عورت یہاں سے کہیں چلی گئی ہے تو وہ پریشان ہو اُٹھا۔

کملیش کو بُلا کر اُس نے کہا ــــ "جاتی ہو کیا ہو گیا ہے!"

"کیا بات ہے؟" کملیش نے چونک کر پوچھا۔

گھنشیام نے واپس آئے ہوئے تینوں خط اُس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "ساوتری کہیں چلی گئی ہے۔ خط واپس آگئے ہیں۔"

کملیش نے غور سے واپس آئے ہوئے خطوں کو دیکھا اور پھر اُس نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کوئی رشتہ دار آگیا ہو اور اُسے اپنے ساتھ لے گیا ہو!"

"مجھے یقین نہیں آتا۔" گھنشیام نے کہا۔ "اُس کا کوئی رشتہ دار نہیں۔ ایک چچا ہیں لیکن جنہوں نے اُس کی زندگی برباد کر دی۔ اُس کے باپ کی ساری جائیداد پر قبضہ کر لیا۔ اُنہیں اُس سے ہمدردی کیوں ہونے لگی؟"

کملیش خاموش ہو گیا۔

بیوی کے لفظوں میں بھی کوئی تسلی نہ پا کر گھنشیام بے چین ہو اُٹھا۔ دُوسرے دن وہ خود کلکتہ گیا۔ جس فلیٹ میں ساوتری رہتی تھی وہاں پر گنپتی جہاشے نام کے ایک سجّن نے ڈیرا ڈالا ہوا تھا۔ اُنہیں کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ وہ صرف اتنا ہی بتا سکے کہ جب وہ یہاں آئے تو فلیٹ خالی تھا۔ اُنہوں نے پگڑی دے کر کرایہ پر لیا۔

پڑوس میں ایک وکیل صاحب رہتے تھے۔ اُن سے ساوتری کا ذکر کیا تو ناک سے چشمہ اُتار کر کہنے لگے ــــ "کون ساوتری؟ ہم نے تو اِس نام کی کوئی عورت نہیں دیکھی آپ کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔"

شیلندر بابو سے ملاقات ہوئی تو اُن کی دھرم پتنی نے اتنا بتایا کہ کچھ دن پہلے ساوتری سخت بیمار تھی۔ منہ سے خون آتا تھا۔ وہ اُس سے ملنے گئی تو وہ ایک پیلے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ کوئی نوکر چاکر نہیں تھا۔

"اُس نے کوئی اور بات نہیں بتائی تھی کیا؟" گھنشیام نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" شیلندر بابو کی دھرم پتنی نے نہایت سادگی سے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "کچھ سمجھ نہیں آتا۔" گھنشیام سر پکڑ کر صوفے پر بیٹھ گیا ــــ اگر وہ بیمار تھی تو اُسے اطلاع دے دیتی۔ علاج کا فوراً انتظام ہو جاتا۔ لیکن اُس نے اپنے کسی خط میں اُس کا

ذکر بھی تو نہیں کیا۔ جانے سے پہلے اطلاع بھی نہیں دی۔ جہاں گئی وہاں سے بھی خط نہیں لکھا۔

مایوس ناکام گھنیشام لوٹ آیا۔ زندگی میں اُسے کئی پیچ پیچیوں کا سامنا ہوا تھا۔ لیکن اب کے ساوتری نے اچانک غائب ہو کر ایک ایسی گتھی پیش کر دی تھی جسے سلجھانا اُسے مشکل نظر آ رہا تھا۔

نینی تال سے واپسی پر جیل خانے کی ہوا کھانے پر گھنیشام کو ساوتری کے خیال نے جتنا پریشان کیا تھا آج اُس سے بھی زیادہ دُکھ ہو رہا تھا۔

دو تین مہینے گزر گئے اُسی حالت میں۔ گھنیشام کی پریشانی میں کمی نہیں ہوئی کملیش کو بھی پتی کے اِس دُکھ کا احساس تھا۔ وہ اِس اندیشے سے کہ کہیں اُس کا خاوند کوئی خطرناک قدم نہ اُٹھائے اُس کی دلجوئی کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتی تھی۔

ایک دن گھنیشام دوپہر کے وقت اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا سرت چندر کا ناول بڑی دیدی پڑھ رہا تھا کہ نوکر نے ایک لفافہ لا کر دیا۔ اُس نے کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ پڑھتے پڑھتے اُس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ خط ساوتری کا ہی تھا۔ اُس نے لکھا تھا۔

بڑے بھائی!

پرنام۔

اُس روز اچانک غائب ہوتے وقت تمہیں اطلاع دینا ضروری تھا۔ لیکن میں نے مناسب نہیں سمجھا کیونکہ زندگی کا ایک راز ایسا بھی تھا جسے میں تم پر ظاہر کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ تم مجھ سے نفرت کرنے لگو گے یا تم مجھ سے کوئی تعلق رکھنا مناسب نہیں سمجھو گے لیکن اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے میں آج کل دہلی ہوں۔ پتی کا پتہ ملتے ہی بیماری کی حالت میں یہاں چلی آئی تھی۔ انہیں ڈھونڈھنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوئی۔ انہیں کوئی مشورہ اچھا نہیں لگتا۔ اُن کے

دل میں کوئی خوف ہی نہیں رہا۔ یہ لوگ خطرناک کھیل کھیلنے میں مصروف ہیں۔ ایک شخص مولوی عبدالجبار ان کا سرغنہ ہے۔ یہ سب مل کر عورتوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ کوکین بیچتے ہیں۔ جوئے کے اڈے چلاتے ہیں اور انسانی زندگی میں جو بھی گناہ ہوتا ہے کرنے سے باز نہیں آتے۔ میرا یہاں سے نکلنا ممکن نہیں۔ کیونکہ میں ابھی تک بیمار ہوں۔ خون کی قے آتی ہے اور ڈاکٹر اسے خطرناک مرض قرار دیتے ہیں۔ اِس لئے اگر تم کسی طرح یہاں آجاؤ تو شاید مجھے ذہنی کوفت سے نجات حاصل ہو۔

تمہاری بدنصیب بہن

ساوتری

خط پڑھ کر گھنشیام کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اُس کے ہاتھ کانپنے لگے اور دماغ چکرانے لگا ـــــ گوپی ناتھ بابو اور عبدالجبار! وہ گوپی ناتھ بابو کے متعلق بڑی سے بڑی بات سوچ سکتا تھا لیکن اُس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ عبدالجبار سے اُس کا تعلق ہوگا۔ عبدالجبار کا نام پڑھ کر بھی گھنشیام سناٹے میں آگیا تھا۔ اُس نے سوچا ـــــ اب کچھ بھی ہو ساوتری کا بچ نکلنا ناممکن ہے۔ وہ چاہے بھی تو اُس کی مدد نہیں کر سکے گا۔ کیونکہ اگر عبدالجبار کو معلوم ہو گیا کہ گھنشیام کہاں ہے اور کس حالت میں رہتا ہے تو اُس کی بھی خیر نہیں۔

فرض اور ہمدردی کے درمیان اُس کی ماضی کی زندگی کا ایک ورق خوف کی شکل میں آہنی دیوار کی طرح حائل ہو گیا تھا۔ گھنشیام پاگل ہو اُٹھا۔ اُس نے سوچا ـــــ کیا اُسے ساوتری کے لئے اپنی دولت۔ اپنی شہرت بلکہ اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھونے کا خطرہ مول لینا چاہیئے یا نہیں۔

دو تین روز سوچتے رہنے سے اُس کا دماغ خراب ہونے لگ گیا تھا۔ اُس کے سامنے اپنی عزت اور زندگی اور ساوتری کے مستقبل کے علاوہ ایک اور شخصیت کے مستقبل کا سوال بھی تھا اور وہ شخصیت تھی ـــــ کملیش کی۔ اُس نے سوچا۔ کیا مجھے یہ حق ہے کہ میں ایک کی ہمدردی کے لئے دوسرے کی زندگی تباہ کر دوں۔ مجھے اپنے آپ کو تو تباہ

کرنے کا حق ہے لیکن کملیش نے کون سا قصور کیا ہے کہ اُسے بھی جیون بھر آنسو بہانے پڑیں۔

اُس نے کملیش سے ساری بات کر دی تھی۔ اُس نے عبدالجبّار سے اپنے ماضی کے تعلقات کا ذکر بھی کر دیا تھا۔ کملیش چونک پڑی تھی۔ اُسے بھی خطرہ نظر آنے لگا تھا۔ لیکن خاوند پر اُسے غصّہ نہیں آیا۔ اُس نے اُسے کوسنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ بلکہ اُس کی گود میں منہ چھپا کر اُس نے بچّوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

کملیش کو اِس طرح روتے دیکھ کر اُس کے دِل میں محبّت اور ہمدردی کا طوفان اُٹھ آیا۔ اُس نے کملیش کو اُٹھا کر اُس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "تم میرے جیون کی ساتھی ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے کتنی محبّت ہے۔ مجھے تمہارا پورا خیال ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر مجھے اپنا خیال ہے۔ ساوتری کی امداد تو کروں لیکن عبدالجبّار کو معلوم ہو جائے یہ خطرہ مول لینے کو تیّار نہیں۔"

کملیش ابھی تک اداس تھی۔ اُس نے خاوند کے پاؤں کی دھول اپنے ماتھے پر لگاتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "میرے لئے تو تمہارے سوا اور کوئی نہیں جو مناسب سمجھو کرو۔"

چودھواں باب

اُس روز عبدالجبار سے ڈر کر اُس نے ساوتری کے خط کا کوئی جواب نہیں دیا تھا
اُس نے سوچا تھا کہ ساوتری کو کوئی خط نہیں ملے گا تو خود ہی خاموش ہو جائے گی اور معاملہ اس طرح ختم ہو جائے گا لیکن اس کے بعد اُس نے سوچا اگر ساوتری اِس صدمے سے مر گئی یا اُس نے خودکشی کر لی تو ــــ؟

کتنا بھیانک تصور تھا! وہ کانپ اُٹھا لیکن اُسے کوئی حل بھی نہیں سوجھتا تھا۔ دن اسی طرح گزر گئے۔ یہ نہیں کہ وہ اس واقعہ کو بھول گیا ہو۔ لیکن نہ بھول کر بھی وہ کیا کر سکتا تھا۔ اور پھر ساوتری کا ایک اور خط آیا۔ اس نے اُسے رُلا دیا۔ اُس نے اِس طرح سے لکھا تھا:۔

پوجیہ بھائی۔ نمستے۔

یہ دوسرا خط ہے۔ تمہارا کوئی جواب نہیں آیا۔ اس سے میری پریشانی اور بھی بڑھ رہی ہے۔ چاروں طرف تاریکی دیکھتی ہوں تو مایوس ہو جاتی ہوں۔ اُمید کی بھی ایک ہی کرن تھی۔ سوچتی ہوں کیا وہ بھی میرے لئے بجھ جائے گی؟

تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟ اُن کے سُدھرنے کی کوئی اُمید نہیں۔ اُن کی زیادتیاں بڑھ رہی ہیں۔ میری ہی آنکھوں کے سامنے میری دُنیا اُجڑ رہی ہے! جانے سنسار میں مجھے ابھی کتنے اور سانس لینے ہیں۔ لیکن انہیں اس کا خیال بھی نہیں۔ انہیں روکتی ہوں

تو دوسروں کے سامنے پیٹنے لگ جاتے ہیں۔ انہیں نہ تو عزت کا خیال ہے نہ ہی میری بیماری کا۔

کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بھگوان سے پرارتھنا کرتی ہوں کہ میری جان لے لے مگر موت تو بھی نہیں آتی۔

دن رات تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ اگر تم بھی نہیں آؤ گے تو میرے جیون میں آشا کا آخری دیپ بھی بجھ جائے گا۔

تمہاری چھوٹی بہن
بدنصیب ساوتری

گھنشیام کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگی۔ کملیش نے کمرے میں داخل ہو کر یہ بات دیکھی نہیں تھی لیکن گھنشیام نے کملیش کو دیکھ کر فوراً منہ پھیر کر اپنے آنسو پونچھ لئے تھے۔

کملیش نے مسکراتے ہوئے کہا ـــ "آج سینما نہیں جاؤ گے؟ وقت تو کافی ہو گیا ہے۔"

"ہوں" ـــ کہہ کر گھنشیام چونک پڑا۔

کملیش نے کہا ـــ "میں تو تیار ہوں۔ تم بھی جلدی جلدی تیار ہو جاؤ۔"

گھنشیام نے خط جیب میں ڈال کر کپڑے تبدیل کئے اور موٹر میں سوار ہو کر سینما کا رُخ کر لیا۔

کملیش اُس کے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔ گھنشیام خود ہی کار چلا رہا تھا۔ کملیش کا دایاں ہاتھ اس کے بائیں ہاتھ میں تھا اور وہ ایک ہی ہاتھ سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ کملیش خوش تھی۔ مسکرا رہی تھی۔ لیکن اُسے کیا معلوم تھا کہ اس کے پتی دیو کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ اگر گھنشیام کے بس کی بات ہوتی تو شاید وہ دل چیر کر دکھا دیتا۔ شاید وہ سب کچھ چھوڑ کر دنیا میں پھینکتا اور اپنے آنسوؤں سے ساوتری کے پاؤں کو بھگو دیتا لیکن ـــ لیکن وہ سینما ہال میں پہنچ کر اس نے جو منظر دیکھے وہ اس کے دل میں کھٹکتے گئے فلم کی

کہانی اُس کے واقعات سے مشابہت تو نہیں رکھتی تھی لیکن کوئی بات تھی جو اُس کے دل و دماغ پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ کملیش کچھ نہ سمجھ سکی۔ اُسے اندیشہ بھی نہیں ہوا کہ اُس کے خاوند کے دل میں ایک ساتھ کتنے ہی طوفان اُمڈ رہے ہیں۔ ایک ساتھ کتنی ہی بجلیاں کوند رہی ہیں اور وہ ایک خطرناک مستقبل کا تصوّر کر رہا ہے۔

انٹرول سے پہلے ہی اُس نے کہا ـــ "میرا جی نہیں لگتا۔ میں جا رہا ہوں"۔

کملیش چونک پڑی۔ اُسے کچھ اندیشہ ہو گیا۔ اُس نے کہا ـــ "چائے پی لو"۔

"نہیں مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ گھنشیام نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

کملیش جھنجھلائی لیکن خاموش ہو گئی۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کا خاوند جذباتی ہے۔ جذبات کی رو میں بہہ جائے تو اُسے روکنا کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

کار میں بیٹھتے ہوئے اُس نے کہا ـــ "کیوں نہ باغ میں گھوم آئیں۔ شاید تمہاری طبیعت ٹھکانے آ جائے"۔

"نہیں" گھنشیام نے اُداسی کے لہجے میں کہا ـــ "ہمیں لوٹ کر گھر ہی جا:

کملیش خاموش رہی۔ اُس نے کوئی دُوسری بات نہیں کی۔

گھر پہنچ کر وہ بستر پر لیٹ گیا۔ کملیش پہلے تو دُوسرے کمرے میں چلی گئی اور کواڑ، رونے لگی۔ دِل کا غُبار ہلکا ہونے پر اُس نے آنسو پونچھے۔ منہ ہاتھ دھویا اور خاوند میں جا کر اُس کی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ خاوند کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اُس نے کہا ـــ "اب طبیعت کیسی ہے؟"

گھنشیام کی آنکھوں سے گویا آنسوؤں کا دریا اُمڈنے والا ہو۔ کملیش نے اُسے اپنی مسکراہٹ سے تھام لیا۔ گھنشیام کا جی بھر آیا۔ اُس کے خیالات نے ایکدم پلٹا کھایا۔ اُس نے اُٹھ کر کملیش کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا ـــ "تم مجھے معاف کر دو۔ میں تمہیں بہت دُکھ دے رہا ہوں"۔

کملیش اپنے لبوں پر مصنوعی مسکراہٹ لے آئی۔ اُس نے کہا ـــ "تم تو میرے ایشور ہو۔ میرے جیون کے سہارے۔ تم ایسی باتیں کرتے ہو تو مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔ سوچو

ہوں کہ ان باتوں کی وجہ سے نہ جانے مجھے مرنے کے بعد کتنے خوفناک نرک کنڈ میں گرنا پڑے گا۔"

گھنشیام کے دل پر گویا چوٹ سی لگی۔ بیوی کی معصومیت اور مظلومی پر اُس کا دل رو اُٹھا۔ اُس نے اُسے چھاتی سے لگاتے ہوئے کہا ——"کیا کروں دل کی حالت ہی کبھی کبھی ایسی ہو جاتی ہے کہ اپنے آپ پر اختیار ہی نہیں رہتا۔ اِس میں تمہارا کوئی دوش نہیں۔"

کملیش نے اپنے آپ کو اُس سے چھڑائے بغیر ہی کہا ——"میں سب کچھ جانتی ہوں۔ اِس لئے مجھے کوئی غصّہ نہیں آتا۔ کوئی ناراضگی نہیں ہوتی۔"

گھنشیام نے اُسے چھوڑ دیا اور سنجیدگی سے کہنے لگا ——"کوئی وقت تھا جب میں سمجھتا تھا کہ ساوتری کے بغیر میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔ اُس نے مجھے ایک نیا جیون دان دیا تھا۔ وہ میری دُنیا میں اُمیدوں کی مسکراہٹیں لے کر آئی تھی۔ یہ مسکراہٹیں چھن گئیں تو مجھے ایسا لگا کہ میں تاریکی میں بھٹک رہا ہوں۔ کئی برس دماغی طور پر کوفت رہی۔ تم میری زندگی میں آئیں تو مسرت کی گھٹائیں لے کر۔ میرا جیون بدل گیا۔ اب ساوتری ایک بالکل نئے رُوپ سے زندگی میں داخل ہوئی ہے۔ ایک مظلوم کی شکل میں۔ دِل میں آگ سی بھڑکتی ہے۔ مگر کچھ نہیں کر سکتا۔ اپنے آپ کو بے بس پاتا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے ہاتھ بندھ گئے ہیں۔"

کملیش سنجیدگی سے سُن رہی تھی۔ اُس نے پُوچھا ——"کوئی اور خط آیا ہے کیا؟"

"ہاں" کہتے ہوئے گھنشیام نے وہ خط کملیش کے ہاتھ میں دے دیا۔

کملیش خط پڑھنے لگی اور گھنشیام کہتا گیا ——"اب کے بھی کچھ سمجھ نہیں آتا۔ ایسی اُلجھن میں پڑ گیا ہوں کہ کوئی صورت ہی نظر نہیں آتی۔ اگر اُس نے آمرتیا کر لی تو؟"

کملیش چونک پڑی۔ اُس نے کہا ——"کیا کہا ہے؟ کسی آدمی کو کیوں نہیں بھیجا دیتے؟"

گھنشیام کو یہ بات اچھی لگی۔ اُس نے کہا ——"ٹھیک ہے نوکر بھیج دیتے ہیں وہ اُسے کسی طریقے سے لے آئے گا۔"

"اور مولوی کو بھی کسی بات کا علم نہیں ہوگا" کملیش نے سنجیدگی سے کہا۔

گھنیشام چارپائی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد کچھ سوچ کر اُس نے کہا — "اگر میں بھی چلا جاؤں تو —" اور کملیش کے کوئی اعتراض کرنے سے پہلے ہی کہا — "میں اُس کے گھر نہیں جاؤں گا۔ نوکر ہی جائے گا۔ سٹیشن پر ہم تینوں اکٹھے ہو جائیں گے۔ اِس طرح سے اُسے سفر میں بھی کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔"

کملیش کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ظاہر تھا کہ وہ یہ خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھی۔

تفاصیل تیار ہونے لگیں اور اِس طرح سے ایک اور رات گزر گئی۔ صبح سویرے گھنیشام کو ایک ضروری کام سے کلکتہ جانا تھا۔ کملیش کو اطلاع دے کر وہ چلا گیا۔

کلکتہ کے بڑے سٹیشن پر اُترتے ہی جونہی اُس نے ہاکر سے اخبار لے کر پڑھنا شروع کیا تو ایک خبر پڑھتے ہی وہ کانپ اُٹھا۔ خبر کی عبارت کچھ اِس طرح تھی:۔

" دہلی۔ ۲۱ر جون:۔ یو۔ پی کے مشہور وکیل گوپی ناتھ بابو کی لاش دریائے جمنا سے برآمد ہونے سے یہاں کے تمام حلقوں میں سنسنی اور دہشت پھیل گئی ہے۔ لاش ننگی تھی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے اُسے قتل کر کے اپنا جرم چھپانے کے لئے اُسے موٹر میں ڈال کر جمنا میں بہا دی ہے۔ پولیس کا سپیشل سٹاف سرگرمی سے اِس واردات کی تفتیش کر رہا ہے۔ لیکن ابھی تک قاتلوں کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ اِس سلسلے میں تفاصیل کا انتظار کیا جا رہا ہے۔"

گھنیشام کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ اُسے یاد آیا کہ ایک مرتبہ پہلے بھی ایک وکیل کو قتل کر کے اُس کی لاش اُسی کی موٹر میں جمنا میں بہا دی گئی تھی۔ وہ یہ جانتا تھا کہ یہ حرکت مولوی عبدالجبار نے کی تھی۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ گوپی ناتھ بابو بھی عبدالجبار کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اُتارے گئے ہوں۔ لیکن ساوتری کا کیا ہوگا۔ اُس نے اپنے آپ سے RI
پوچھا اور ایک بھیانک تصوّر سے کانپ گیا۔ وہ وکیل تھا اور جانتا تھا کہ ایسی حالت میں مقتول کی بیوی کو کتنی پریشانی ہوتی ہے۔ پولیس تفتیش کرتی ہے۔ لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے اور طرح طرح کی باتیں اُٹھتی ہیں اور پھر وہ تو اکیلی ہے۔ اس کا کوئی سہارا بھی تو نہیں ہے۔

وہ ایک لمحہ کے لئے رُکا اور پھر اپنے آپ سے کہا۔ کچھ بھی ہو مجھے وہاں ابھی پہنچنا چاہئے۔ ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرنا چاہئے۔

وہ اُلٹے پاؤں لوٹا۔ بکنگ آفس کا رُخ کیا۔ پھر رُکا۔ سوچنے لگا اور اِس کے بعد بکنگ آفس کے سامنے جاکر اُس نے سو روپے کا نوٹ رکھتے ہوئے کہا — "دہلی کا فرسٹ کلاس کا ٹکٹ چاہئے۔"

پلیٹ فارم پر پہنچ کر اُس نے ایک تار بیوی کے نام اور دوسرا ساوتری کے نام بھیجا اور فوراً دہلی جانے والی گاڑی پر سوار ہو گیا۔

سفر کے دوران میں اُسے اپنے تن بدن کی سدھ نہیں رہی تھی۔ اُس نے چائے تک نہیں پی تھی۔ فرسٹ کلاس کے ڈبے میں سفر کر رہا تھا۔ اس ڈبے میں وہ اکیلا ہی تھا اور کتنی بار وہ بچوں کی طرح رو دیا کئی بار لگتا یوں لگتا گویا دہلی پہنچتے ہی عبدالجبار اُس کے سامنے آجائے گا اور اُسے کسی نہ کسی طرح گرفتار کرا دے گا۔ اِس کے بعد اُسے ساوتری کا خیال آتا تو اُسے [illegible]

دھندلی روشنی میں ماحول اور بھی زیادہ خوفناک نظر آتا تھا۔

گھنشیام نے پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا — "ساوتری کہاں ہے؟"

"اندر ہے۔" بڑھیا نے چراغ دکھاتے ہوئے کہا — "آیئے۔"

گھنشیام کے پاؤں کانپ رہے تھے۔ اُس کا دماغ چکرا رہا تھا۔ خاموشی سے اُس کی پیروی کرتے ہوئے وہ آگے بڑھا اور صحن سے گزر کر کمرے میں داخل ہوا تو اُس نے جو کچھ دیکھا اُس سے اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور ایک زور کی چیخ سی نکل گئی۔

گندے سے غلیظ سے کمرے میں ایک طرف دیکھا کہ ساوتری ٹوٹی ہوئی چارپائی پر پڑی تھی جو بالکل بے جان سی معلوم ہوتی تھی۔

گھنشیام نے کہا — "ساوتری!"

ساوتری کے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔

بڑھیا نے کہا — "اِن کی حالت بہت خراب ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا

گھنشیام کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اُس نے کہا ــــ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ تمہارا علاج ہوگا اور تم تندرست ہو جاؤ گی۔"

ساوتری کے لبوں پر پھیکی ہنسی آئی۔ اُس نے رُکتے رُکتے کہا ــ "اب مجھے کچھ نہیں چاہیئے گھنشیام بابو! کچھ نہیں چاہیئے۔ زندگی کا چراغ ٹمٹما رہا ہے..... اسے.... بجھنے سے.... نہ تم..... روک سکتے ہو..... نہ ہی میں۔"

اچانک اُسے زور کی کھانسی آئی۔ بڑھیا گھبرا اُٹھی۔ اُس نے پانی کا گلاس لے کر کہا ــــ "منہ میں ڈال دو پانی۔"

ساوتری نے اُسے روک دیا۔ اُس کی کھانسی اور زیادہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اُس نے اشارہ کیا تو گھنشیام نے اُسے سہارا دے کر اُٹھایا۔ ساوتری نے اُٹھتے ہی خون کی قے کرنی شروع کر دی۔

گھنشیام نے بڑھیا سے کہا ــــ "کوئی ڈاکٹر ہے نزدیک؟"

بڑھیا خاموش رہی۔

ساوتری نے رُک جانے کے بعد لیٹتے ہوئے کہا ــــ "اب ڈاکٹر کچھ نہیں کر سکے گا گھنشیام بابو۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔"

گھنشیام سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی آخری یا حد درجہ جدوجہد کرنا چاہتا تھا۔ تیزی سے کمرے سے نکل کر باہر ہو گیا اور منٹوں میں ڈاکٹر کو بلا لایا۔

ڈاکٹر نے دوائی دی، انجکشن لگایا اور صبح پھر آنے کا وعدہ کر گیا۔ لیکن گھنشیام کو یہ معلوم کرنے میں مشکل پیش نہ آئی کہ مریض آخری دموں پر ہے۔

ساری رات جاگتے گزری۔ کھانس کھانس کر اُس کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ گھنشیام اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ کر دل ہی دل میں رو رہا تھا۔ نہ جانے اُس نے کتنی بار آنسو بہائے تھے کتنی بار بیتے دنوں کے منظر اُس کی آنکھوں کے سامنے آئے۔

ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ بڑھیا کو کچھ نیند آ گئی تھی۔

گھنشیام ساوتری کے سرہانے بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا۔ گھنشیام نے دیکھا تو چونک پڑا۔ کملیش سامنے کھڑی تھی۔

ساوتری کی آنکھیں کھلیں۔ اُس نے کملیش کو دیکھ کر کہا ــــ "آؤ"۔

کملیش خاموشی سے اُس کے نزدیک آگئی۔ اُس کی پیشانی کو چھوتے ہوئے اُس نے کہا ــــ "کیا حال ہے تمہارا دیدی؟"

ساوتری نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے اُس کے ہاتھ کو چھوا اور پھر بلک بلک کر رونے لگی۔

گھنشیام اور کملیش دونوں خاموش تھے۔ کملیش نے خاوند سے کہا ــــ "تم منہ ہاتھ دھولو۔ میں اِن کے پاس بیٹھتی ہوں"۔

ساوتری نے کہا ــــ "میرے کارن تم دونوں کو ناحق تکلیف ہو رہی ہے۔ میں ہمیشہ تمہارے لئے تشویش کا باعث بنی رہی ہوں۔ اِس لئے تم اِس آخری تکلیف کو معاف کر دو۔ اگر تم نہ آتے تو مجھے بہت دُکھ ہوتا۔ شاید مرنے کے بعد بھی میری آتما کو شانتی نہ ملتی۔ مگر اب میں مطمئن ہوں۔ اب میں سکھ سے مروں گی۔ اب مجھے کوئی نہیں ہوگی"۔

ساوتری کی آنکھیں پتھرا رہی تھیں۔ اُس کی آواز رُک گئی تھی۔ کملیش ڈاکٹر کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اُس نے چلّا کر کہا ــــ "دیدی یہ تمہیں کیا ہو رہا ہے"

بڑھیا چونک کر جاگ اُٹھی۔ گھنشیام نے غور سے دیکھا تو اُس کا دل دھک کر رہا تھا۔ اُس کے منہ سے بھی چیخ نکل گئی۔ ساوتری کا سر اپنی گود میں لیے کہا ــــ "ساوتری!"

بڑھیا نے لپک کر اُس کے منہ میں پانی ڈالتے ہوئے کہا ــــ "ہوش میں آ میری بچی۔ کیا ہو رہا ہے تمہیں؟"

کملیش اور گھنشیام کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔

کملیش نے کہا ــــ "ڈاکٹر کو بلاؤ"۔

"اب کوئی ضرورت نہیں"۔ بڑھیا نے مایوسی کے لہجے میں کہا ــــ "آخری سانس آرام سے ہی نکلنے چاہییں"۔

ساوتری کا سر ابھی تک گھنیشام کی گود میں ہی تھا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ یکایک اُس کے ایک ہاتھ میں حرکت ہوئی۔ اُس نے ٹٹولتے ہوئے گھنیشام کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ گھنیشام کو ایسے لگا گویا محبت کے تھپے ہوئے طوفان جاگ اُٹھے ہوں۔

اُس نے کہا ــــ "ساوتری بہن!"

ساوتری نے آنکھیں کھولیں اور فوراً ہی بند کر لیں۔ اُس کا سر ایک طرف جھک گیا۔ بڑھیا چلّا اُٹھی۔ "میری بچّی! گھنیشام اور کملیش کی چیخ نکل گئی۔ ساوتری کا انت ہو چکا تھا۔

(ختم شد)